مجلّہ طلوع اسلام کا اجراء 1938ء میں علامہ اقبالؒ کے ایما اور قائداعظمؒ کی خواہش پر عمل میں آیا۔

قرآنی نظام ربوبیت کا پیامبر

طلوع اسلام

ماہنامہ ______ لاہور

خط و کتابت

ناظم ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)

25 بی گلبرگ۔ 2 لاہور 54660

ٹیلی فون : 876219

فیکس : 42-876219

انتظامیہ ادارہ طلوع اسلام

چیئرمین:۔ بریگیڈئر (ریٹائرڈ) اعزاز الدین احمد خاں

ناظم:۔ محمد لطیف چوہدری

مدیر مسئول:۔ محمد لطیف چوہدری

مجلس ادارت:۔ میجر محمد یوسف ڈار۔ محمد عمر دراز

ناشر:۔ عطاء الرحمٰن ارائیں

طابع:۔ خالد منصور نسیم

مطبع:۔ النور پرنٹرز و پبلشرز

3/2 فیصل نگر ملتان روڈ لاہور۔ 54500

مقام اشاعت:۔ 25-B گلبرگ 2 - لاہور۔ 54500

فہرست مشمولات

لمعات	ادارہ	2
قائداعظمؒ	صفدر سلیمیؒ	4
ہماری نظریاتی بنیادوں کو کھوکھلا کیا جارہا ہے	اعزاز الدین احمد خان	22
روئیداد کنونشن 94ء	ایم لطیف چوہدری	32
حقائق و عبر	ادارہ	47
نبی اکرمؐ شیعہ تھے نہ سنی	علی محمد چدھڑ	49
ڈوبتے سورج کی صدا	عظمت ناز	53
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے	بشیر احمد عابد	60
حکم عدولی توہین آقا ہے	حسین امیر فرہاد	71
بیاد عندلیب	سعید قطبی	76
انگریزی مضمون	رفیق احمد	80

جلد 47 شمارہ 12 دسمبر 1994ء

بدل اشتراک

فی پرچہ -/10 روپے اندرون ملک 120 روپے بیرون ملک : 18 امریکی ڈالر

لمعات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

1- پاکستان کی سیاست حاضرہ

پاکستان کی سیاست حاضرہ پر اگر کوئی شخص دو لفظوں میں تبصرہ کرنا چاہے تو اس کے لئے اتنا کہہ دینا کافی ہو گا کہ اس وقت پاکستان کی فضا سیاسی مخاصمت اور ایک دوسرے کے خلاف نفرت کے جذبات سے معمور ہے اور جب مخاصمت اور نفرت کی وسعت اور شدت کا یہ عالم ہو تو اس قوم سے اس کی توقع بیکار ہے کہ وہ کسی معاملے پر ٹھنڈے دل سے سوچ اور بچار کے بعد کسی نتیجے پر پہنچ سکے۔

نفرت کے جذبات یکطرفہ ٹریفک نہیں ہوتے۔ جب کسی ایک طرف سے نفرت اور حقارت کا اظہار ہوتا ہے تو فریق مخالف کا رد عمل بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ اس طرح باہمی نفرت اور عداوت کا ایک ایسا دائرہ وجود میں آجاتا ہے جس میں ایک جذبہ اسی قسم کے دوسرے جذبہ کو جنم دیتا چلا جاتا ہے اور ساری قوم اس زہر آلود فضا میں سانس لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔

پچھلے دنوں مرکزی قانون ساز اسمبلی اور سینٹ کا مشترکہ اجلاس بلایا گیا۔ صدر مملکت نے قومی اسمبلی اور سینٹ کے اراکین سے خطاب کرنا تھا لیکن اسمبلی ہال کا دروازہ کھلا تو یوں نظر آیا جیسے چڑیا گھر کے پنجرے کھل گئے ہیں اور ہمارے لیڈران کرام باہمدگر گتھم گتھا ہو رہے ہیں۔ اسی ایک اجلاس میں یہ لوگ اس طرح ننگے ہوئے ہیں کہ مصلحت کوشیوں کا دبیز سے دبیز پردہ بھی ان کا سر نہ ڈھانپ سکے گا۔

ایک دوسرے کے ساتھ الزام تراشی' دشنام دہی' طعن و تشنیع' طنز و لمز' ہفوات و مکذبات' راز ہائے دروں خانہ کی پردہ دری' انداز سوقیانہ' اسلوب مخاصمانہ' زبان ایسی بازاری کہ حیا سے آنکھیں جھک جائیں اور شرافت نگوں ہو جائے۔

ہمیں تو یہ احساس کھائے جا رہا ہے کہ دنیا ملت پاکستانیہ کے متعلق کیا کہہ رہی ہو گی۔ جب لیڈران کی یہ حالت ہے تو عوام جس سطح پر اتر آئیں گے' اس کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ جسم پر خوف سے رعشہ طاری ہو جاتا ہے۔ حیرت ہے کہ ملک میں کوئی ایک رجل رشید بھی ایسا نظر نہیں آتا جو ان حواس باختہ مدہوشوں کو ہوش میں لانے کی کوشش کرے۔ اس سے بڑھ کر کسی قوم کی سوختہ بختی اور کیا ہو سکتی ہے؟ بقول غالب:

ناخدائے خفتہ کو تو جگایا جا سکتا ہے لیکن جس کشتی کے ناخدا ہوش و خرد سے بیگانہ ہو کر پاگلوں کی طرح چپو چلانے لگ جائیں تو اس کشتی کو کون بچا سکتا ہے؟

بہی خواہان پاکستان کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ وہ ان جذبات نفرت و عداوت کے سرچشمہ کا

سراغ لگائیں اور پھر کوشش کریں کہ وہ کسی طرح بند ہو جائے تاکہ اس بدقسمت سرزمین کی فضا اعتدال پر آجائے۔

روپے اور پراپیگنڈہ کے زور پر ہنگامہ آرائیاں برپا کر کے دوسروں کو مرعوب تو کیا جا سکتا ہے لیکن ایسی روش اور اس قسم کی ذہنیت کے حصہ میں بقا نہیں ہوتی۔ خدا کا اٹل قانون ہے کہ یہاں بقا اسی کو نصیب ہو سکتی ہے' جو اس پروگرام کو لے کر اٹھے جو اقدار سماوی کے مطابق عام انسانیت کے لئے منفعت بخش ہو (13:17) اس لئے یہاں بھی آخر الامر بقا اسی کی ہو گی جو قرآن کے اس نظام کو لیکر اٹھے گا۔ جھکڑ اور آندھیاں درختوں کو جڑ سے اکھیڑ سکتی ہیں۔ لہلہاتی کھیتیاں پیدا نہیں کر سکتیں۔ جو جماعت اس راز کو پالیگی وہی نوع انسانی کی نفع بخشیوں کا ذریعہ بنے گی اور ثبات و بقا اسی کے حصہ میں آئیگی۔

2- بلدیہ عظمیٰ لاہور کے سفید ہاتھی

ادارہ طلوع اسلام 25- بی گلبرگ 2 لاہور اپنے ہاں ہر سال کنونشن کا اہتمام کرتا ہے جس میں لنڈی کوتل سے لیکر ساحل سمندر تک کے مندوبین شریک ہوتے ہیں۔ بیرونی ممالک سے آنے والے مہمانوں کی تعداد بھی کم نہیں ہوتی۔

کنونشن کے انعقاد سے تین ماہ قبل بلدیہ عظمیٰ کے ایڈمنسٹریٹر سے درخواست کی گئی کہ ادارہ کے سامنے 15 گز کے قریب سڑک انتہائی خستہ حالت میں ہے۔ اسے مرمت کروا دیا جائے۔ ایڈمنسٹریٹر صاحب نے از راہ کرم اس کی منظوری دے دی لیکن بلدیہ کے فنانس ڈیپارٹمنٹ نے اسے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ گلبرگ کے اس حصہ کے لئے کوئی فنڈز مختص نہیں۔ ایڈمنسٹریٹر صاحب سے دوبارہ رجوع کیا گیا تو انہوں نے حکم دیا کہ سڑک کو RE-SURFACE کرنا ممکن نہ ہو تو کم از کم (PATCH WORK) پیچ ورک ضرور کر دیا جائے۔ زون 4 کے ایگزیکٹو انجینئر۔ سب ڈویژنل آفسر اور سب انجینئر کے پاس بار بار چکر لگائے گئے بلدیہ عظمیٰ لاہور کی عزت کا واسطہ دیا گیا' لیکن بات وعدہ فردا سے آگے نہ بڑھ سکی تاآنکہ 4 نومبر 94ء کو ملک بھر سے آئے ہوئے مندوبین نے بلدیہ عظمیٰ لاہور کی یہ غفلت مجرمانہ اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ ادھر اہالیان لاہور یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ گلبرگ کے مراعات یافتہ علاقہ کی یہ حالت ہے تو ان آبادیوں میں کارپوریشن کی کارکردگی کیا ہو گی جہاں کارپوریشن کے یہ سفید ہاتھی قدم رنجہ فرمانے تک کی زحمت بھی گوارا نہیں کرتے۔

قند مکرر

قائداعظمؒ

کتاب زندگی کا اجمالی جائزہ

(تقدیر کی اذاں تھا محمد علی جناحؒ)

(محترم صفدر سلیمی رحمتہ اللہ علیہ)

کم و بیش 54 سال قبل ــــــ 23 مارچ 1940ء کا آفتاب ایک عظیم صبح انقلاب کا نقیب بن کر چالیس کروڑ انسانوں کے افق تقدیر پر طلوع ہو رہا تھا۔ وقت اور حالات کا قافلہ ایک نیا موڑ مڑ رہا تھا۔ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد تاریخ کا ایک نیا ورق الٹ رہی تھی اور مورخ کا قلم ایک نئے باب کا عنوان باندھ رہا تھا۔ ایک طرف یہ سب یہ کچھ ہو رہا تھا اور دوسری جانب دریائے راوی کے کنارے دو لاکھ انسان اس قومی عزم کو سینوں میں لئے جمع تھے کہ تاریخ کا رخ موڑ دیں۔ اور صدیوں کے قومی زوال اور شکست کی تاریکیوں سے ایک نئی صبح بہار کا عنوان پیدا کریں۔ منٹو پارک کے اس عظیم الشان قومی دربار میں ایک مغنی آتش نفس کی آواز گونج رہی تھی۔

ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح
ملت کی جسم جاں ہے محمد علی جناح

اور قومی دربار کا ہر فرد محسوس کر رہا تھا کہ ان کے خلوص بھرے جذبات واحساسات کی اس سے بہتر ترجمانی ممکن نہیں۔ اور پھر جب اس نے کہا کہ

لگتا ہے ٹھیک جا کے نشانے پہ جس کا تیر
ایسی کڑی کماں ہے محمد علی جناح

تو ''قائداعظم زندہ باد'' کے گردوں شگاف نعرے والہانہ شہادت کے امین بن کر فضا میں گونج اٹھے۔ سب کی نگاہیں مسند صدارت پر مرکوز ہو گئیں۔

آتش نوائی کا یہ سلسلہ آگے بڑھا۔

غیروں کے دل بھی سینوں کے اندر دہل گئے
تقدیر کی اذاں ہے محمد علی جناح

تاریخ کی ایک لازوال حقیقت ان الفاظ کی پہنائیوں میں رقص کر رہتی تھی۔ راوی کے کنارے جھوم اٹھے۔ شاہی مسجد کے مینار وجد میں آگئے اور ان کے سائے میں میٹھی نیند سونے والے مرد قلندر کی روح پکار اٹھی!

مرغ چمن! ہے یہی تیری نواؤں کا صلہ

مسند صدارت پر رونق افروز قائداعظم کی پلکوں پر انتہائی ضبط کے باوجود قطرات اشک تیرنے لگے۔

گردش لیل و نہار برق رفتاریوں سے تاریخ کے کئی کٹھن مرحلے طے کر گئی۔ ملت پاکستان کا کاروان عزم و ہمت دشوار گذار راہوں کو پامال کرتا ہوا عسکری انقلاب کی بارگاہ جلال میں داخل ہو گیا۔ 54 سال کی یہ مدت اپنے شب و روز کے جلو میں تیزی سے گذر گئی۔ لیکن تاریخ کے اس نقش تابندہ کی آب و تاب آج بھی بعینہٖ شادابی قلب و نظر کا وہ سماں پیدا کر رہی ہے جسے وقت کی رفتار متاثر نہیں کر سکی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا یہی تاریخی اجلاس تھا جس نے محمد علی جناح کی صدارت میں قرارداد پاکستان کے نام پر اپنی قومی منزل کا تعین کیا اور پھر اسی دور اندیش قافلہ سالار کی قیادت میں ہماری ملت نے اس کڑی منزل کو سات سال کی مختصر مدت میں اس فاتحانہ شان سے طے کیا کہ آج مورخ کے لئے پاکستان اور قائداعظم کے مابین حد فاصل یا خط امتیاز قائم کرنا ممکن نہیں رہا۔ یہی گرانمایہ قیادت تھی جس نے پاکستان کے قومی نصب العین پر مہر تصدیق ثبت کی اور پھر ملت کے قدم اس حسن تدبیر سے نصب العین کی طرف بڑھاتی چلی گئی کہ ایک ایک سنگ میل نے زبان حال سے شہادت دی کہ محمد علی جناحؒ ہماری ملت کا پاسبان بھی تھا اور اس کے سینے میں مچلتی ہوئی روح بھی۔ نہ صرف یہ کہ اس کا ہر تیر ٹھیک نشانے پر بیٹھا بلکہ اس نے اپنے حریفوں کے دلوں میں قدم قدم پر ایک زلزلہ بھی پیدا کئے رکھا۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے اٹل فیصلے بالآخر تقدیر کی اذاں ثابت ہوئے اور اس نے صفحہ قرطاس پر جو لکیریں کھینچیں وہ اس برصغیر کی تقسیم کا مستقل عنوان اور چالیس کروڑ انسانوں کی تقدیر کا آخری فیصلہ قرار پا گئیں۔

ہماری تاریخ کا یہ ایک خوشگوار اور خوش آئند انقلاب تھا جس نے نہ صرف غیر ملکی سامراج کے بندھن توڑ کر رکھدیئے بلکہ برادران وطن کی رام راج کی سازشوں کا تاروپود بکھیر کر ہمیں ایک آزاد اور خود مختار مملکت کی نعمت عظمٰی سے بھی مالا مال کر دیا۔ کیا یہ اسی دیدہ ور کے حسن تدبر اور ملکہ فراست کا شاہکار نہیں کہ آج ہمیں ایک آزاد مملکت کے آزاد شہری بننے کا شرف حاصل ہے؟ اسی عظیم اور لازوال تاریخی حقیقت کا روح نواز احساس ہے جس نے آج ہمیں اس سعادت سے بہرہ ور کیا

ہے کہ ہم اس بلند و بالا شخصیت کے آستانہ عظمت پر تحسین و تبریک کی غریبانہ نذر پیش کریں اور اس کے تدبر اور فراست کے ان زندہ جاوید کارناموں کو منظر اشاعت پر لائیں جن کے صدقے میں ایک مایوس اور شکست خوردہ قوم موت کی ہچکیوں سے نجات پاکر عروج واقبال' آزادی واستقلال اور حکومت و سلطنت کی وارث قرار پا گئی۔

یورپ کے شہرہ آفاق صحافی بیورلی نکلس نے انتہائی یقین واعتماد سے اسے "ایشیا کا اہم ترین انسان" قرار دیا تھا۔ اور آج جب ہم اس کی کتاب زندگی کے اوراق الٹ رہے ہیں تو ہمارا دل یقیناً اس حقیقت سے سرشار ہے کہ جہاں وہ ہماری ملت کا محبوب قائداعظم تھا وہاں اغیار کے انصاف پسند حلقوں میں اسے "ایشیا کے اہم ترین انسان" کا منصب جلیل بھی حاصل تھا۔ حقیقت پسند بیورلی نکلس کی دور بین نگاہیں قیام پاکستان سے چار سال قبل (1943ء میں) پردۂ تقدیر سے کیا کچھ ابھرتے دیکھ رہی تھیں۔ یہ جاننے کے لئے اس کی شہرہ آفاق کتاب "ورڈکٹ آن انڈیا" کے ان الفاظ پر غور کیجئے۔

> ہندوستان بلا شبہ چند ہی سال میں دنیا کا اہم ترین مسئلہ بن جائے گا۔ اور مسٹر جناح اس باب میں عدیم النظیر نازک اہمیت کے حامل ہیں۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق جس طرف چاہیں جنگ کا رخ موڑ سکتے ہیں۔ دس کروڑ انسان ان کی چشم وابرو کے اشارے پر حرکت میں آنے کے لئے کمربستہ ہیں۔ یہ مقام کسی اور کو حاصل نہیں۔ ہندو حلقوں میں بھی یہ بات نہیں۔

یہ ہے عظمت قائد کے اعتراف کا ایک تابندہ نقش----- ان ہزاروں زندہ جاوید نقوش میں سے جن کی تابناکیوں سے پوری تحریک پاکستان اور اس کا پس منظر جگمگا رہا ہے۔ اس نے یکساں طور پر اپنوں اور بے گانوں کے دلوں پر اپنی عظمت کا سکہ بٹھایا اور سب نے برملا اس کے اوصاف و کمالات کی زبان حال سے پکار پکار کر شہادت دی۔

حیات قائد کی ان تعارفی تفاصیل میں حسن ترتیب اور ربط باہمی کا تقاضا ہے کہ سب سے پہلے ہم ان کی کتاب زندگی کا ایک مختصر سا جائزہ مجموعی طور پر پیش کر دیں۔

قلمی خاکہ قائداعظمؒ کی پراثر شخصیت کے ذہن میں ابھرتے ہی تاریخ چشم تصور کے سامنے ایک نحیف و نزار لیکن بہترین انگریزی لباس میں ملبوس "مرد مشرق" کو لا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ مانٹیگو چمسفورڈ اسکیم کے سلسلہ میں وزیر ہند مسٹر مانٹیگو ہندوستان کے دورے پر تشریف لاتے ہیں۔ اور اس دور کے چوٹی کے لیڈروں--- مہاتما تلک گوکھلے' دادا بھائی نورو جی وغیر ہم---- سے ملاقات کرتے ہیں اور ساتھ ہی چونتیس سالہ خوبصورت جناح سے بھی۔ (یہ 1918ء کا قصہ ہے) اور پھر وہ اپنی ڈائری میں اس جواں سال اور پختہ کار سیاستدان کے متعلق اپنے تاثرات قلمبند کرتے ہوئے لکھتے ہیں-----

> ایک صاف ستھرا' انتہائی باسلیقہ نوجوان جس کی چال ڈھال دل پر گہرا اثر ڈالتی ہے۔ گفتگو میں منطقی' داؤ پیچ کا زبردست ماہر۔ اپنی بات کو سولہ آنے منوانے کا مدعی' وہ اپنی رائے میں کسی ترمیم کا روادار نہیں۔ اگر اس کی پوری بات نہ مانی جائے تو آدھی بات ماننے پر بھی راضی نہیں ہو گا۔ میں اس سے باتیں کر

کے ہار گیا- لارڈ چمسفورڈ نے اس سے بحث کرنے کی کوشش کی لیکن جناح کی قوت استدلال نے اسے پوری طرح الجھا کر چاروں شانے چت گرا دیا- وہ ایک انتہائی ذہین شخصیت کا مالک ہے اور اس سے بڑھ کر حقوق کی پامالی اور کیا ہو سکتی ہے کہ جناح جیسے انسان کو بھی نظام مملکت میں دخل حاصل نہ ہو-

بیورلی نکلس اس سے ملاقات کے بعد اس کی عظمت کا خاکہ کھینچتا ہوا لکھتا ہے-

دراز قد، چھریرا بدن، وضعدار، سلک سوٹ زیب تن کئے ہوئے اور یک چشمی عینک لگی ہوئی- ایک سخت سفید کالر گلے میں، جسے وہ شدید گرمیوں میں بھی استعمال کرنے کا عادی ہے- وہ شرفاء ہسپانیہ کی طرح نظر آتا ہے- سیاسی مسلک میں کہنہ مشق مدبر- ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کوئی باعظمت شخصیت سینٹ جیمس کلب میں رونق افروز کوئی لطیف سا مشروب نوش جان کر رہی ہے اور جریدہ "دی ٹیمز" کے مطالعہ میں مصروف ہو-

(VERDICT ON INDIA)

طفولیت کی وادیوں سے کارگہ شباب کی طرف یہ تھا وہ قائداعظم جس نے 25 دسمبر 1876ء کو نیو نہم روڈ کراچی کے "وزیر مینشن" میں جنم لیا- حسن اتفاق کی کرشمہ سازیاں دیکھئے کہ جب ستر برس بعد، قائداعظم کے حسن تدبیر کا شاہکار ایک عظیم اسلامی مملکت کی صورت میں منصۂ شہود پر آیا تو ان کے ہی مولد کو اس مملکت نو کا دارالسلطنت بننے کا اعزاز حاصل ہوا جہاں انہوں نے میدان حیات میں آنکھ کھولی- جہاں کے "سندھ مدرسۃ الاسلام" میں انہوں نے "بغدادی قاعدہ" اور عربی و فارسی کی چند کتابیں پڑھیں- اور پھر ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بمبئی یونیورسٹی سے میٹرک کا امتحان امتیازی شان سے پاس کرنے کے قابل ہو گئے-

اس مدت میں اس ہونہار طالب علم کی ذہانت و فطانت کے کرشمے اعزاواحباب کے حلقے میں جگمگا اٹھے تھے- اور اپنے خاندان کے ایک مخلص دوست سرفریڈرک کرافٹ کے مشورے پر سولہ سال کی عمر میں یہ سلجھا ہوا نوجوان بیرسٹری کی تعلیم کے لئے عازم انگلستان ہو رہا تھا- لاریب کہ اس نے "لنکن ان" سے بڑے امتیاز کے ساتھ بیرسٹری کے امتحان میں کامیابی حاصل کی- لیکن دوران تعلیم وہ اسی ایک مقصد پر مطمئن ہو کر نہیں بیٹھا- طالب علمی میں وہ زیادہ وقت پارلیمنٹ میں برطانوی مدبرین کی تقریریں سننے کے لئے وقف کرتا- انہیں لبرل پارٹی کے مکتب فکر سے بالخصوص وابستگی تھی اور اس مکتب کے ممتاز نمائندین سے انہوں نے رابطہ بھی قائم کیا- آئرش ہوم رول کی تحریک کے سلسلہ میں عظیم سیاست دان مسٹر گلیڈ سٹون کی پرجوش تقریریں ان کے ذوق سیاست کا مرکز بنی رہیں- یہ وہ زمانہ تھا جب کہ لیبر پارٹی بڑی تیزی سے برطانوی عوام کی ہمنوائی سے اقتدار کی طرف بڑھ رہی تھی- ہرچہار اطراف آزادی نسواں کے چرچے تھے- اور ہندوستان سے ہمدردی کا جذبہ بڑی تیزی سے ابھر رہا تھا- ہونہار، دور اندیش اور بیدار مغز جناح کا اس ماحول سے متاثر ہونا قدرتی تھا- استخلاص وطن کے مخلصانہ جذبات نے ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھر کر قلب و نظر کو کافی سرشار کر رکھا تھا- عین اس مرحلہ پر انگلستان میں ایک ایسا واقعہ رونما

ہوا جس نے ان کے جذبات و احساسات میں ایک تہلکہ سا مچا دیا۔ ہندوستان کے برگزیدہ رہنما دادا بھائی نوروجی ان دنوں اپنے سیاسی مشن کے تحت انگلستان میں قیام پذیر تھے۔ ہر ہندوستانی انہیں قدر و احترام کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور جناح تو یوں سمجھئے گویا انہیں اپنا "سیاسی استاد" تصور کرتے تھے۔ برطانوی وزیراعظم لارڈ سالسبری کو دادا بھائی نوروجی سے ایک سیاسی کد سی تھی۔ چنانچہ انہوں نے ایک تقریر میں اس محترم ہندوستانی رہنما کو "کالا آدمی" کہہ کر ان کا مضحکہ اڑایا۔ لارڈ سالسبری کے یہ توہین آمیز الفاظ یورپ میں مقیم ہندوستانی طالب علموں کے لئے وجہ اشتعال ثابت ہوئے۔ انہوں نے اس اہانت آمیز چیلنج کا منہ توڑ جواب دینے کے لئے دادا بھائی نوروجی کو ایک حلقہ انتخاب سے پارلیمنٹ کے لئے امیدوار کھڑا کر دیا اور خم ٹھونک کر میدان میں آ گئے۔ ایم اے جناح اور سی آر داس ہندوستانی طلباء کی اس مہم کی قیادت کر رہے تھے۔

بیرسٹری کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد یہ گرمجوش لیکن سلجھا ہوا نوجوان 1896ء میں اپنے وطن واپس لوٹتا ہے اور واپس پہنچ کر دیکھتا ہے کہ ان کے والد محترم کا کاروبار تباہ ہو چکا ہے۔ اور پورا خاندان مالی مشکلات سے بری طرح دوچار ہے۔ حالات بے حد دگرگوں تھے۔ چاروں طرف مایوسیوں کا دور دورہ تھا۔ کوئی دوسرا شخص ہوتا تو ان مایوسیوں کا شکار ہو کر رہ جاتا اور ابتلاء و آزمائش کے اس طوفان سے شکست کھا کر اپنے آپ کو گوشہ گمنامی کے سپرد کر دیتا۔ لیکن جناح کے سینے میں فولاد کا دل تھا۔ وہ وقت اور حالات کے جانکاہ تھپیڑوں سے نبرد آزمائی کے لئے پیدا ہوا تھا۔ اس نے طوفانوں سے کھیلنا اور ستاروں پر کمندیں ڈالنا سیکھا تھا۔ اس نے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کا عزم کر لیا اور سب کے مشوروں کو ٹھکرا کر کراچی کے بجائے بمبئی کے ہنگامہ گلزار میں پہنچ گیا۔

کامرانیاں قدم چومتی ہیں

بمبئی کے ابتدائی تین سال بڑے ہی کٹھن مرحلوں میں طے ہوئے۔ اتنے بڑے شہر میں بے یار و مددگار نوجوان کے لئے جس کی زندگی آسائشوں سے مالا مال تھی نت نئی پریشانیوں مایوسیوں اور تلخیوں کا سامنا تھا۔ قدم قدم پر ٹھوکریں ہی ٹھوکریں تھیں۔ لیکن جناح ان انسانوں سے مختلف تھے جو زندگی کی کڑی آزمائشوں میں احساس بے چارگی سے دب کر رہ جاتے ہیں۔ ان کا سینہ ایک مرد خود آگاہ کے عزم بلند سے معمور تھا۔ وہ ہمت و جرات کے ہتھیاروں سے مسلح تھے۔ اس کے دل میں کوہ پاش ولولوں کی آگ سی سلگ رہی تھی۔ وہ ان تمام مصائب و مشکلات سے مردانہ وار نبرد آزما رہے اور بالآخر سب کو شکست فاش دے کر ممکنات زندگی کی وہ راہیں ہموار کر لیں جہاں منزلیں قدم لینے کو آگے بڑھتی ہیں اور فتح و کامرانی کا ابر بہار سر پر سایہ فگن ہو جاتا ہے۔

تین سال بعد جب یکایک ابتلاؤں کی تاریکیاں چھٹیں تو بمبئی کے پریزیڈنسی مجسٹریٹ کی مسند اعزاز اس پچیس سالہ نوجوان کا خیر مقدم کر رہی تھی۔ اب انہیں اپنے حالات سنوارنے کا سنہری موقع میسر آتا ہے۔ لیکن ترقی پسند جناح زیادہ دیر تک اس منصب پر قناعت نہیں کرتے۔ اور جب عدلیہ کے انچارج سر چارلس اولیونٹ پندرہ سو روپے ماہوار مشاہرہ پر یہ عارضی منصب انہیں مستقل طور پر پیش کرتے ہیں تو مسٹر جناح شکریہ کے ساتھ یہ کہتے ہوئے اس پیش کش کو مسترد کر دیتے ہیں کہ "میں کم

سے کم پندرہ سو روپے روزانہ کمانے کا پروگرام بنا چکا ہوں"۔ سر چارلس اسے مجذوب کی بڑ سمجھ کر بمشکل اپنے طنزیہ قہقہے کو ضبط کرتے ہیں۔ لیکن بہت جلد وہ بڑی حیرت سے سنتے ہیں کہ اس نوجوان کی پریکٹس واقعی پندرہ سو روپے روزانہ سے زیادہ ہے۔

پارلیمانی اور عملی سیاسیات کے کارزار میں جناح اب بمبئی کے ایک کامیاب بیرسٹر ہیں۔ چاروں طرف ان کی قانون دانی کی دھوم سی مچی ہے۔ وہ مشکلات و موانعات کے چکر سے نجات حاصل کر چکے ہیں۔ انہیں زندگی کی تمام سہولتیں اور فراغتیں میسر ہیں۔ چنانچہ ان کا قدم ملی سیاسیات کی خار زار وادیوں کی طرف بڑھتا ہے۔ وہ سب سے پہلے 1905ء میں دادا بھائی نوروجی کے پرائیویٹ سیکریٹری کی حیثیت سے آل انڈیا نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس کلکتہ میں شریک ہوتے ہیں۔ 1909ء میں سپریم امپیریل کونسل کے انتخاب میں بلا مقابلہ کامیاب ہونے کا سہرا ان کے سر بندھتا ہے۔ 1913ء میں وہ بغرض تفریح عازم انگلستان ہو جاتے ہیں۔ وہیں ہندوستانی طلباء کی "سنٹرل ایسوسی ایشن" کا سنگ بنیاد رکھتے ہیں اور وہیں سر وزیر حسن کی پرخلوص دعوت پر پہلی بار آل انڈیا مسلم لیگ کی باضابطہ رکنیت قبول کرتے ہیں۔ مئی 1914ء میں وہ ایک بار پھر انڈیا کونسل کی اصلاح کے سلسلے میں کانگریس کے نمائندے بن کر انگلستان جاتے ہیں۔ اور وہاں ہندوستانی طلباء اور ہندوستان دوست انگریزوں کی طرف سے ان کا پرجوش خیر مقدم کیا جاتا ہے۔ قیام انگلستان کے دوران میں وہ انتہائی جرات، صاف گوئی اور قوت استدلال سے ہندوستان کا نقطہ نظر انڈیا کونسل کے متعلق برطانوی مدبرین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اور واضح کرتے ہیں کہ جس کونسل میں ہندوستان کو حقیقی نمائندگی حاصل نہ ہو وہ مفید نتائج پیدا کرنے کی اہل قطعاً" نہیں۔

ہندو مسلم اتحاد کا طائر پیش رس اس حقیقت کو پیش نظر رکھئے کہ جناح کی سیاسی زندگی کا یہ دور ہندو مسلم اتحاد کی شبانہ روز کوششوں کا ایک مستقل باب ہے۔ کانگریس کے ساتھ مسلم لیگ میں ان کی شمولیت بھی اسی احساس کی مظہر تھی۔ 1910ء میں الہ آباد کی ہندو مسلم کانفرنس ان کی انہی مساعی کا نشان اور اسی شریف ترین جذبہ کی آئینہ دار تھی۔ اس کانفرنس میں ملک کے چوٹی کے زعماء شریک ہوتے ہیں اور جناح اس کانفرنس کے روح رواں ہیں۔ بدقسمتی سے یہ تاریخی کانفرنس ناکامی پر منتج ہوتی ہے۔ بڑے بڑوں کے دل مایوسیوں میں ڈوب جاتے ہیں۔ لیکن جناح ان ناکامیوں کا ادنیٰ اثر قبول کئے بغیر پورے عزم و ہمت سے اس خار زار میں رواں دواں آگے بڑھے جاتے ہیں۔ اور چھ سال بعد ہم دیکھتے ہیں کہ ان کا عزم و استقلال فتح مندی سے ہمکنار ہوتا ہے اور "میثاق لکھنؤ" کے نام سے 1916ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے رہنما ہندو مسلم اتحاد کے فارمولے پر بالاتفاق مہر تصدیق ثبت کر دیتے ہیں۔ ملکی سیاسیات میں جناح کی مساعی جمیلہ کا پہلا شاہکار تھا اور اس کے بعد ہر دو قومیں انہیں "سفیر اتحاد" کے خطاب سے یاد کرتی ہیں۔

ہوم رول لیگ کی تحریک ہندو مسلم اتحاد کی اس تحریک کو شعوری طور پر آگے بڑھانے اور سیلف گورنمنٹ کی منزل

تک پہنچنے کے لئے مسز اینی بسنٹ نے ہوم رول لیگ کی تنظیم کی۔ اور جب اس نے عوام کے ذہنوں تک رسائی حاصل کرنے کی جدوجہد کا آغاز کیا تو جناح کو بھی دعوت دی گئی کہ اس پلیٹ فارم سے ہوم رول تحریک کی راہنمائی کریں۔ جناح ادنیٰ پس و پیش کے بغیر آگے بڑھے۔ ان کی گرمجوشیوں سے تھوڑی ہی مدت میں اس تحریک کا پلیٹ فارم استخلاص وطن کی جدوجہد کا موثر ترین پلیٹ فارم بن گیا اور اس کی گونج سات ہزار میل دور وہائٹ ہال تک کی فضاؤں میں زلزلہ انداز ہونے لگی۔ اسی دور رس آواز کا اثر تھا کہ لارڈ ہارڈنگ نے برطانوی پارلیمنٹ میں تقریر کرتے ہوئے انگریزوں اور ہندوستانیوں کو مشترکہ دعوت دی کہ وہ ان کے دور حکومت پر پوری آزادی سے تبصرہ کریں۔ جناح اس دعوت کو لبیک کہتے ہوئے مردانہ وار آگے بڑھے اور ہوم رول لیگ کے پلیٹ فارم سے جوابی تقریر کرتے ہوئے پہلے وائسرائے بہادر کی فراخدلی کا اعتراف کیا۔ اور پھر جنگ عظیم میں اہل ہند کی بے مثال قربانیوں کا ذکر کرتے ہوئے دو ٹوک الفاظ میں کہا۔

> ان قربانیوں کے باوجود ہندوستان سے کیا سلوک روا رکھا جا رہا ہے؟ باوجود اتنا خون گرانے کے ہندوستان کو اس کی قیمت کیا مل رہی ہے؟ کیا ان قربانیوں کا یہی صلہ ہے کہ آزادی کے علمبردار جیلوں میں بند کئے جا رہے ہیں۔ آخر قربانیوں کا زبانی اعتراف کر لینے سے کیا ہوتا ہے------ یہ جنگ' آزادی اور استقلال کی بقا کے لئے لڑی گئی تھی۔ کیا دفتری حکومت اندھی تھی؟ کیا ارباب حکومت فاتر العقل تھے جو جنگ جیتنے کے بعد ہندوستانیوں سے ایسا سلوک روا رکھنے پر اتر آئے؟ یاد رکھیئے کہ یہ طرز عمل حکومت کے ذہنی اور سیاسی افلاس کا نشان ہے۔ (قائداعظم محمد علی جناح)

جناح کے انہیں نعرہ ہائے حریت کا اثر تھا کہ 10 اگست 1917ء کو وزیر ہند نے دارالعوام میں اعلان کیا کہ----

> ملک معظم کی حکومت کی پالیسی یہ ہے کہ ہندوستانیوں کو انتظامی معاملات میں زیادہ سے زیادہ مواقع دیئے جائیں۔ اور رفتہ رفتہ حکومت برطانیہ کے اس حصہ میں سیلف گورنمنٹ کی بنیاد (قائداعظم محمد علی جناح)

وزیر ہند مسٹر مانٹیگو اس اعلان کے بعد خود ہندوستان میں تشریف لائے۔ انہوں نے یہاں چوٹی کے سیاسی رہنماؤں سے ملاقاتیں کیں اور بالاخر اس کا نتیجہ مانٹیگو چمسفورڈ اسکیم کی اصلاحات کی صورت میں منظر عام پر آیا۔

استعمار پسندوں سے ٹکراؤ عین اس وقت جبکہ وزیر ہند مسٹر مانٹیگو اور وائسرائے لارڈ چمسفورڈ اپنی مساعی جمیلہ سے ہندوستان کو مطمئن کرنے کی جدوجہد میں سرگرم کار تھے۔ حکومت ہند میں ایسے استعمار پرست انگریز حکمران بھی موجود تھے۔ جن کے دلوں میں ہندوستانیوں کے خلاف نفرت و حقارت کی آگ سلگ رہی تھی۔ انسانی آزادی اور حریت کے یہ ازلی دشمن کسی قیمت پر یہ گوارا کرنے کے لئے تیار نہیں تھے کہ اس بدنصیب ملک کی غلامی کی زنجیریں ٹوٹنے پائیں۔ لارڈ سیڈ نہم اور لارڈ ولنگٹن جو یکے بعد دیگرے بمبئی کے گورنر مقرر ہوئے اپنی مذموم سازشوں کی بنا پر اس طائفہ میں سب سے پیش پیش تھے۔ جناح اس وقت آزادی کے ہیرو اور ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی آنکھ کا تارا شمار ہوتے تھے۔ انہوں نے کچھ دیر امپریلزم کے

ان بدمستون کی کارستانیوں کا جائزہ لیا اور پھر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ جواں سال اور جوان بخت ہیرو انتہائی جرات و بے باکی سے ان پر ٹوٹ پڑتا ہے۔

یہی ہے وہ رجعت پسند جو ایک عرصہ دراز تک ہندوستان کی مہمان نوازی سے لطف اندوز رہا۔ جس نے ہندوستان کے خزانے سے بیش قرار تنخواہیں وصول کیں اور اب یہ ایسی سازشوں کی رہنمائی کر رہا ہے جو کسی شریف انسان کے لئے باعث فخر نہیں ہو سکتیں۔ میں اس کی ساری بکواس کا یہی جواب دے سکتا ہوں کہ جب یہاں کے عوام حق خود اختیاری کے قابل ہو جائیں گے تو وہ اس کے پاس اس حق کے لئے بھیک مانگنے نہیں جائیں گے۔

(نوائے وقت (اشاعت خاص) 23 مارچ 1960ء

اور پھر اس کے بعد وہ لارڈ ولنگٹن سے نبرد آزما ہوتا ہے۔ اور اس کے پنجے توڑ کر رکھ دیتا ہے۔ 11 دسمبر 1917ء کو بمبئی کے ٹاؤن ہال میں یہ معرکہ آرائی ہوتی ہے۔ حکومت کے چند زر خرید لارڈ مذکور کو بمبئی سے الوداع کرتے ہوئے اہالیان شہر کی طرف سے اسے ایڈریس پیش کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ جناح لارڈ ولنگٹن کی مکروہ سازشوں سے بخوبی آگاہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس نے اپنے منصب جلیل کا احترام بالائے طاق رکھ کر کس بدباطنی سے مسلم لیگ کے بمبئی کے اہم اجلاس کو سلیمان قاسم مٹھا جیسے غنڈوں کے ذریعے ناکام بنانے کی درپردہ سازش کی تھی۔ چنانچہ وہ اپنے رفقاء سمیت ٹاؤن ہال کے اس سرکار پرست اجتماع میں پہنچ جاتے ہیں۔ اور جب پولیس انہیں وہاں سے بزور باہر نکال دیتی ہے تو ٹاؤن ہال کے باہر اہالیان بمبئی کا نمائندہ اور تاریخی اجتماع ہوتا ہے اور کروڑوں انسانوں کا یہ زعم اس اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے عوام کی قوت اور اپنی عظمت کے جھنڈے گاڑ دیتا ہے۔ لارڈ ولنگٹن اور اس کے حاشیہ برداروں کے منصوبوں کے پرخچے اڑاتے ہوئے وہ اپنے فتح مند اور پرجوش حاضرین سے کہتا ہے۔

آپ نے آج جمہوریت کو کامیابی سے ہمکنار کر دیا۔ آج آپ نے دنیا پر واضح کر دیا کہ نوکر شاہی اور مطلق العنانی دونوں مل کر بھی آپ کو خوفزدہ نہیں کر سکتیں۔ 11 دسمبر کا دن بمبئی کی تاریخ میں جشن مسرت کا دن ہے۔ جایئے اور خوشیاں منایئے۔ آج جمہوریت کی فتح اور سربلندی کا دن ہے۔

عوام کی کامیابی اور جمہوریت کی فتح کے ساتھ ساتھ یہ دن قائداعظمؒ کی فائز المرامی کا دن تھا۔ بمبئی کے عوام ان کے اعزاز میں جناح میموریل ہال کا سنگ بنیاد رکھ رہے تھے۔ اور بلبل ہند سروجنی نائیڈو وارفتگی کے عالم میں نعرہ لگا رہی تھیں "پیامبر اتحاد زندہ باد"۔

استبداد کا مقابلہ جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی۔ ہندوستان کے جانباز سپاہی مشرق وسطیٰ کے میدانوں میں خون کی ندیاں بہا کر برطانیہ کی سرخروئی اور فتحمندیوں کا پرچم بلند کر چکے تھے۔ ان قربانیوں کا حق ادا کرنے کے لئے مانٹیگو چمسفورڈ کے نام پر چند

رسمی اصلاحات کے نفاذ کی راہ ہموار کی جا رہی تھی۔ عین اس وقت جبکہ یہ نمائشی کھیل رچایا جا رہا تھا۔ امپیریلزم کے ایوانوں میں عوام کی جمہوری امنگوں کے خلاف ایک پر فریب اور خطرناک سازش بھی پرورش پا رہی تھی۔ یہ تھا رولٹ ایکٹ جیسے تشددانہ اور ظالمانہ قانون کے نفاذ کا منصوبہ۔ اس تعزیری قانون کے ذریعے عوام کی آزادی تحریر و تقریر اور اظہار مافی الضمیر کے خلاف حکومت کو ہولناک ہنگامی اختیارات سے مسلح کیا جا رہا تھا۔

جناح یہ سب کچھ دیکھتے ہیں اور عوام کی نمائندگی کا حق ادا کرنے کے لئے وہ امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے اجلاس میں پورے غیض وغضب سے آتش فشاں پہاڑ کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں۔ رولٹ ایکٹ کے خلاف ایوان کونسل میں ان کی یہ تقریر زور خطابت' قوت استدلال' غیرت قومی اور قہر و جلال کا ایک سیلاب تھی جو برطانوی نمائندوں کے سارے دلائل کو تنکوں کی طرح بہا کر لے گئی۔ لیکن یہ بل منظور کر لیا گیا اور جناح کی غیرت کے لئے اس کے سوا کوئی اور چارہ کار نہ رہا کہ وہ امپیریل کونسل کی رکنیت سے مستعفی ہو جائیں۔ اس سلسلہ میں وائسرائے بہادر کے نام قائداعظم کا احتجاجی خط ایک تاریخی یادداشت کی حیثیت رکھتا ہے۔

رولٹ ایکٹ برطانوی حکومت کی تشدادانہ پالیسی کا آئنہ دار ثابت ہوا۔ پورے ملک میں اس کے خلاف غم و غصہ کی ایک آگ سی بھڑک اٹھی۔ جگہ جگہ ہڑتالیں اور مظاہرے ہوئے۔ جوابا" پولیس اور فوج نے انتہائی بربریت اور استبداد کا مظاہرہ کیا۔ حادثہ جلیانوالہ باغ اس ظلم و استبداد کا انتہائی انسانیت سوز مظہر تھا۔ امرتسر کے اس باغ میں کوئی بیس ہزار کا اجتماع عام رولٹ ایکٹ کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لئے جمع تھا کہ جنرل ڈائر فوج کا ایک دستہ لے کر نمودار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے حکم پر سینکڑوں انسان خاک و خون میں تڑپنے لگے۔ وحشت وبربریت کا یہ وہ ہیبت ناک شاہکار تھا۔ جس کے خلاف پورے ملک میں غیض و غضب کا طوفان برپا ہو گیا۔ جناح اس صورت حال پر مہر بہ لب کیونکر رہتے۔ جوش غضب سے وہ گویا چیخ اٹھے اور کہا۔۔۔

> رسوائے عالم صدر رولٹ کمیٹی کے "سٹار چیمبر" میں وضع کئے ہوئے قوانین جن پر لارڈ چمسفورڈ کی حکومت نے عمل در آمد شروع کیا ہے ایسے ہیبت ناک جرائم پر منتج ہوئے ہیں جن کو نہ تو کوئی آدمی بیان کر سکتا ہے اور نہ عورتوں کے آنسوؤں کی روانی انہیں دھو سکتی ہے۔۔۔۔۔۔۔ یقیناً اب ہمیں وہی ذرائع اختیار کرنا پڑیں گے۔ جو فرانس اور اٹلی میں اختیار کئے گئے۔
>
> (قائداعظم محمد علی جناح)

اہمسا اور ستیہ گرہ کی بوالعجبیاں اس مرحلہ پر ہم ملی سیاسیات کی تاریخ کو ایک نیا رخ اختیار کرتے دیکھتے ہیں۔ گاندھی جی یکایک "اہمسا" اور "ستیہ گرہ" کے عجیب و غریب پروگرام لئے مہاتمائی روپ میں کانگریس کے پلیٹ فارم سے نمودار ہوتے ہیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی دلفریب بوالعجبیوں سے سب پر چھا جاتے ہیں۔ جناح کی دوربین نگاہیں ان حربوں کو نہ صرف سیاسی

طور پر مضحکہ خیز قرار دیتی ہیں بلکہ انہیں یہ بھی واضح طور پر نصر آتا ہے کہ اس راہ میں مسلمانان ہند بالآخر اس سرمایہ حیات سے ہاتھ دھو بیٹھیں گے جو صدیوں سے ان کی اسلامی نفسیات کے لئے نشان راہ کا کام دیتا چلا آرہا ہے۔ انہوں نے حتی الامکان سب کو اس پروگرام کے نتائج سے خبردار کرنے کی کوشش کی اور جب اس طرح واردھا کے سامری کا جادو نہ ٹوٹ سکا تو 1920ء میں دامن جھاڑ کر کانگریس سے الگ ہو گئے۔ فروری 1921ء میں سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی (بمبئی) کے اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے وہ اپنے موقف کی وضاحت کرتے ہیں اور اہمسا اور ستیہ گرہ کے مضحکہ خیز پروگرام کی مضحکہ خیز حقیقت کو یوں واشگاف کرتے ہیں۔

> حکومت کا مقابلہ کرنے کے لئے سب سے مقدس شے فوجی قوت کا حصول ہے۔ جرمنی نے میدان جنگ میں آنے سے پہلے چالیس سال تک فوجی تیاری کی۔ ہندوستان نے آخر فوجی قوت کا کونسا ذخیرہ جمع کیا ہے۔ اور ہمارے پاس اس نوعیت کے کون سے ذرائع ہیں۔ گاندھی جی نوجوانوں سے کہہ رہے ہیں کہ اسکولوں اور کالجوں کو چھوڑ کر باہر نکل آئیں۔ اور دیہات میں پھیل جائیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ آخر یہ کس لئے؟
> (قائداعظم محمد علی جناح)

کانگریس سے مقابلہ 1922ء میں جناح نے آزاد امیدوار کی حیثیت سے مرکزی امپیریل کونسل کا انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا اور دنیا نے انتہائی حیرت سے دیکھا کہ کانگرس ان کے مقابلہ میں پورے جوش و خروش سے اپنا امیدوار لا رہی ہے۔ ہر دلعزیز جناح آزاد امیدوار کی حیثیت سے کسی سہارے کے بغیر تن تنہا انتخابی میدان میں کھڑے ہیں اور دوسری طرف آل انڈیا نیشنل کانگریس اپنی ملک گیر قوت کے ساتھ ان کے مقابلہ میں پر تول رہی ہے۔ یہ وہی جناح ہیں جو کل تک کانگریس کے پلیٹ فارم کی زیب و زینت تھے۔ جنہیں "سفیر اتحاد" اور "پیامبر اتحاد" کہتے ہوئے ان کی زبانیں نہیں تھکتی تھیں۔ جن کے اعزاز میں جناح میموریل ہال کی تعمیر ہوئی تھی۔ جس کی سیاسی بصیرت، حسن تدبیر اور جرات و بے باکی کانگریس کے لئے بیش بہا سرمایہ نازش و افتخار قرار پا چکا تھا۔ اب وہی کانگریس اس زعیم حریت کو شکست دینے کے لئے مسلح ہو رہی تھی۔

لیکن ہرنگہ بصیرت جناح کی عظمت کردار کے سامنے سرتسلیم خم کر رہی ہے۔ بمبئی کے رائے دہندگان اب بھی اس کی قدر و قیمت کے بخوبی معترف ہیں۔ انہیں اب بھی لارڈ سیڈنہم اور لارڈ ولنگٹن جیسے استعمار و استبداد کے ہیبت ناک مجسموں سے اس بے باک زعیم کے ٹکراؤ کی داستانیں پوری طرح یاد ہیں۔ چنانچہ خود کانگریس کا اپنا آرگن "بمبئی کرانیکل" جرات سے آگے بڑھتا ہے۔ اور جناح کی حمایت میں رائے دہندگان کے نام ایک پرزور اپیل شائع کرتا ہے۔ اس اپیل کے یہ الفاظ قابل غور ہیں۔

> دو ایک سال سے ہمارے اور مسٹر جناح کے درمیان کچھ اختلافات چلے آرہے ہیں۔ لیکن ان کی گذشتہ عظیم الشان خدمات، سچی حب الوطنی اور جذبہ حریت ایسی صفات ہیں جو نہ تو کسی سفارش کی محتاج ہیں

اور نہ ہی کوئی شخص ان کی عظمت کو کم کرنے کی جرات کر سکتا ہے- علاوہ ازیں جناح کے ناقابل تسخیر جذبہ جہاد نے باقی شہریوں کے مقابلہ میں انہیں بہت امتیازی مقام عطا کر دیا ہے اور حقیقتاً وہی ایک ایسی ہستی ہیں جو صحیح معنوں میں اہل بمبئی کی کماحقہ' نمائندگی کر سکتی ہے-------- موجودہ فضا جناح کے مخصوص سیاسی رجحانات اور انداز فکر سے بہترین مناسبت رکھتی ہے- اور اگر معمولی اختلافات کی بنا پر جناح جیسے قائد کو ملی خدمات اور قومی جدوجہد کے اس منصب سے محروم کر دیا گیا- تو یہ ایک ناقابل فراموش ذلت کا ارتکاب ہو گا-

بمبئی کے عوام نے دیوانہ وار اس اپیل پر لبیک کہا- وہ اپنے محبوب زعیم سے بے وفائی کے لئے تیار نہ ہو سکے- کانگریس کا امیدوار میدان چھوڑ کر بھاگ گیا- کانگریس چاروں شانے چت گری- اور بمبئی کے عوام کی آنکھ کا تارا بلامقابلہ کامیابی کا سہرا باندھ کر عوام کی نمائندگی کے لئے امپیریل کونسل میں پہنچ گیا- بلاشبہ جناح نے تیسری گول میز کانفرنس (1935ء) تک ہندو مسلم اتحاد کی مساعی جاری رکھیں لیکن کانگریس پر سے ان کا اعتماد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اٹھ گیا اور تاریخ گواہ ہے کہ جناح کی رفاقت اور مشاورت کو ٹھکرا کر کانگریس کو جو قیمت ادا کرنی پڑی اور پے در پے جن ہزیمتوں سے دو چار ہونا پڑا- اس کی مثال تاریخ کے صفحات سے ناپید نظر آئے گی-

چودہ نکات جناح اور نہرو رپورٹ رولٹ ایکٹ اور حادثہ جلیانوالہ باغ کے حادثات' برطانوی سامراج کی پیشانی پر جور واستبداد کے بدترین داغ ثابت ہوئے- ان داغوں کو دھونے کی جو پر فریب اور نمائشی کوششیں لندن سے شروع کی گئیں- ان میں سائمن کمیشن کے تقرر کا اعلان اہم حیثیت رکھتا ہے اس کمیشن کے قیام کا مقصد آئینی اصلاحات کے نفاذ کے لئے ملکی حالات کا جائزہ ظاہر کیا گیا- لیکن اس کمیشن میں جسے سرجان سائمن کی قیادت حاصل تھی کسی ہندوستانی نمائندے کو شامل کرنے کی ضرورت محسوس نہ کی گئی- یہ اس ملک کے سیاسی شعور اور قومی نمائندگی کی افسوسناک توہین تھی- چنانچہ جونہی وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ نے 8 نومبر 1927ء کو اس کمیشن کے تقرر کا اعلان کیا- ملک کی تمام قابل ذکر سیاسی جماعتوں نے اس کے مقاطعہ کا اعلان کر دیا- جناح نے صورت حال کے ہر پہلو پر سنجیدگی سے غور و فکر کیا- ہندو مسلم اتحاد کے سلسلے میں امید کی ایک نئی کرن ان کے ذہن میں ابھری اور اپنی سیاسی بصیرت کا اشارہ پاتے ہی وہ دلائل و براہین سے مسلح ہو کر میدان میں آگئے- انہوں نے لارڈ برکن ہیڈ اور لارڈ ریڈنگ کے اعلانات کو چیلنج کیا- انہوں نے کمیشن کی ہیئت ترکیبی پر شدید نکتہ چینی کی اور واضح کیا کہ اس کمیشن کا تقرر برطانوی حکومت کے ان تمام دعوؤں کا منہ چڑا رہا ہے جو اب تک ہندوستانیوں کو شریک حکومت بنانے کے لئے کئے گئے تھے-

چنانچہ جونہی 3 فروری 1928ء کو کمیشن نے ساحل بمبئی پر قدم رکھا اس کے مقاطعہ کے سلسلہ دراز کا آغاز ہو گیا- وائسرائے بہادر کی طرف سے تعاون کئے جانے کی تمام اپیلیں پائے استحقار سے ٹھکرا دی گئیں اور پورے ملک میں جگہ جگہ

کمیشن انتہائی مخالفت' کالی جھنڈیوں اور ہڑتالوں کے پرجوش مظاہروں سے دوچار ہو رہا تھا۔ جناح اس میدان میں پیش پیش تھے۔ ان کی کوششوں سے مرکزی اسمبلی نے بھی کثرت رائے سے کمیشن کے ساتھ تعاون کی پیش کش مسترد کر دی۔ اور پھر دیگر ممبران اسمبلی کی رفاقت سے انہوں نے 20 فروری کو ایک اپیل شائع کی کہ تمام سیاسی جماعتیں اور صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کمیشن سے قطع تعلق رکھیں اور ایک آل پارٹی کونشن کے ذریعے ملک کا آئین متفقہ طور پر مرتب کیا جائے تاکہ اسے پورے ملک کے متفقہ مطالبے کی حیثیت سے حکومت کے سامنے رکھ دیا جائے۔

جناح کی ان مخلصانہ مساعی کی بدولت 19 مئی 1928ء کو بمبئی میں آل پارٹیز کانفرنس کا انعقاد ہوا۔ پھر 28 اگست کو لکھنؤ میں یونٹی کانفرنس ہوئی اور اس کانفرنس نے ملکی اتحاد کے سلسلہ میں جو تجاویز طے کیں ان پر آخری بار مہر تصدیق ثبت کرنے کے لئے 22 دسمبر کو آل پارٹیز نیشنل کونشن کا تاریخی اجتماع کلکتہ میں ہوا۔ جناح اس کونشن میں مسلم لیگی وفد کے قائد کی حیثیت سے شریک ہوئے اور اپنے مشہور چودہ نکات پر مشتمل فارمولا پیش کیا۔ لیکن مہاسبھائی عناصر نے ان نکات کی پرزور مخالفت کی اور نہرو کمیٹی کی مرتب کردہ رپورٹ کے مقابلہ میں ان نکات کو جو صورت حال کا بہترین حل پیش کرتے تھے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ ملک کا یہ تاریخی کونشن افراتفری' ذہنی انتشار اور باہمی تلخیوں کی مایوس کن فضا میں ختم ہوا اور اس کی ناکامی نے حکومت کے خود اختیاری کے امکانات تاریکیوں سے ہمکنار کر دیئے۔ ساتھ ہی مسلم لیگ نے اپنے سالانہ اجلاس دلی میں جو قائداعظم کی صدارت میں ہوا نہرو رپورٹ کو کلیتہ" مسترد کر دیا۔

<u>راؤنڈ ٹیبل کانفرنسوں کا دور</u> ہندوستان کی سیاسی زندگی میں اب چاروں طرف مایوسیوں کا گرد و غبار چھا چکا ہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی اعتماد کی فضا کلیتہ" ختم ہو چکی ہے۔ خود مسلمان چھوٹی چھوٹی پارٹیوں میں تقسیم ہو کر ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔ ان کی جمعیت پریشاں اور قومی اتحاد زیروزبر ہو چکا ہے۔ ملک کا ہر رہنما صورت حال سے شدید طور پر متاثر ہے۔ تحریک استخلاص وطن کی نیا منجدھار میں ہچکولے کھا رہی ہے۔ ملک کے مطلع تقدیر پر امید کی ادنیٰ کرن دکھائی نہیں دیتی۔ بگڑی بننے کے امکانات مسدود ہو چکے ہیں مایوسی اور انتشار کی اس دردناک کیفیت میں صرف ایک قائد ہے جو اب بھی خود اعتمادی کی دولت سے مالا مال ہے۔ جو اب بھی پورے یقین واعتماد سے پکار رہا ہے۔

> اخلاقی قوت' دلیری' محنت اور استقلال وہ چار ستون ہیں جن پر انسانی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے۔ میں کبھی ناکامی کے لفظ سے آشنا نہیں ہوا۔

اور یہ وہی جواں ہمت جناح ہے جس کی ملکی اتحاد کی تمام مساعی پر مہا بھارتی ذہنیت نے پانی پھیر دیا۔ جس کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو گلے ملانے کے تمام منصوبے خاک میں ملا دیئے گئے۔ جس نے دونوں قوموں کو آزادی کی نعمت سے مالا مال کرنے کے لئے شب و روز تگ و تاز کی۔ لیکن اس کی پرخلوص صداؤں کو ہمیشہ بہرے کانوں سے سنا گیا۔ لیکن جناح اب بھی مایوس نہیں۔ وہ اپنی زندگی کی محبوب قومی آرزوؤں اور امنگوں کی چتا کو جلتے دیکھ کر بھی مستقبل کے افق سے امیدوں کی نئی کرنیں

تلاش کر رہے ہیں۔

سائمن کمیشن مایوس لوٹ رہا ہے۔ لارڈ ریڈنگ مایوس ہیں۔ وزیر ہند لارڈ برکن ہیڈ کے چہرے پر افسردگی کے آثار ہیں۔ وزیر اعظم برطانیہ ریمزے میکڈانلڈ کا سیاسی تدبر اور فراست کوئی منزل سامنے نہیں پاتے۔ مہاتما کی اہسا اور ستیہ گرہ کی تحریکیں دم توڑ چکی ہیں۔ لیکن جناح! وہ دیکھئے ان کے دل و دماغ اب بھی پوری طرح متحرک ہیں۔ سائمن کمیشن کے انگلستان پہنچنے سے قبل ہی ان کا اہم مکتوب وزیراعظم برطانیہ کی میز پر پڑا ہے۔ وہ حکومت برطانیہ کے تدبر اور فراست سے اپیل کر رہے ہیں کہ "سائمن کمیشن کی رپورٹ اور حکمت ہند کی آراء موصول ہوتے ہی ہندوستان کے لئے حکومت خوداختیاری کا اعلان کریں۔ اور ان آئینی اصلاحات کے خط و خال اور جزئیات متعین کرنے کے لئے لندن میں ہندوستان کے نمائندوں کی مشاورتی کانفرنس طلب کریں۔ وزیراعظم' سرجان سائمن کی واپسی کے منتظر ہیں اور جونہی وہ انگلستان واپس پہنچتے ہیں اور وزیراعظم ان سے جناح کی تجویز کے بارے میں مشورہ طلب کرتے ہیں تو وہ بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں کہ واقعی ہندوستان سے دوستانہ تعلقات استوار کرنے کی یہی ایک راہ باقی ہے۔ یہی وہ واحد اساس ہے جسے از سر نو مذاکرات کا حرف آغاز بنایا جا سکتا ہے۔

سر سائمن کی تائید کے بعد جناح کی تجویز سلطنت برطانیہ کے ممتاز ترین کارفرماؤں کے غور و فکر اور تبادلہ خیالات کی بنیاد قرار پا جاتی ہے۔ برطانوی حکومت اور ہندوستانی رہنماؤں کے مابین ایک کانفرنس کے انعقاد کے امکانات پر پوری سنجیدگی سے غور و خوض کیا جاتا ہے۔ اور بالاخر 1930ء میں پہلی گول میز کانفرنس کا انعقاد عمل میں آتا ہے۔ کانگریس اس کانفرنس کا مقاطعہ کرتی ہے لیکن ہندوستان کے مختلف مکاتیب فکر کے نمائندے انگلستان پہنچتے ہیں اور لندن کا یہ یادگار اجتماع پوری دنیا کی توجہ کا مرکز بن جاتا ہے۔ جناح بہ نفس نفیس اس کانفرنس میں شریک ہوتے ہیں۔ انتہائی خلوص اور قابلیت سے چالیس کروڑ ہندوستانیوں کی ترجمانی کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ لیکن کانگریس کے بائیکاٹ اور مہاسبھائی عناصر کی متعصبانہ ذہنیت کے منفی حربوں کے باعث یہ کانفرنس مثبت نتائج پیدا کرنے میں ناکام ہو جاتی ہے۔

پھر دوسری کانفرنس منعقد ہوتی ہے جس میں کانگریس بھی شرکت کرتی ہے۔ جناح اس کانفرنس کی کامیابی کے لئے شب و روز جدوجہد کرتے ہیں۔ لیکن کانگریس کے لیڈروں کو مفاہمت اور رواداری کی کسی معقول سطح پر لانا ان کے امکان میں نہیں ہوتا۔ یہ کانفرنس بھی ناکام ہو جاتی ہے۔

تیسری گول میز کانفرنس میں جناح شریک نہیں ہوئے وہ زندگی میں پہلی بار سالہا سال کے اس مسلسل سفر سے گریز کی راہ اختیار کرتے ہیں جس کا انہیں نہ کوئی مستقبل نظر آتا ہے اور نہ آگے قدم بڑھانے کے لئے کوئی نشان راہ۔ ان کی زندگی کا یہ عظیم ترین رد عمل نہ صرف مہاسبھائی ذہن کی فساد انگیزیوں کا نتیجہ تھا بلکہ اس سے کہیں زیادہ مہاتما جی اور ان کے چیلوں چانٹوں کی جفائے وفا نما نے ان کے قلب و نگاہ کو متاثر کیا۔ اب ان کی زندگی کا اہم ترین موڑ ان کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ کلکتہ کی آل پارٹیز نیشنل کنونشن اور لندن کی پہلی دو گول میز کانفرنسوں میں جو کچھ انہوں نے اپنی آنکھ سے دیکھا اس کے بعد

ان کا حقیقت پسند ذہن انہیں خوش فہمیوں اور خود فریبیوں میں مبتلا رکھنے کے لئے تیار نہیں تھا- دوسری طرف تاریخ کی ایک نئی حقیقت ابھر کر ان کی نگاہوں کے سامنے آگئی تھی- ہندو لیڈر مختلف قسم کے پُر فریب لبادے اوڑھ کر ہندو قوم کا سنگٹھن مضبوط سے مضبوط تر کئے جا رہے تھے اور ان کی اپنی ملت کا قافلہ صدیوں کے عروج واقبال سے بے نصیب ہو کر سرراہ بھیڑ بکریوں کی طرح منتشر اور پریشان حال کھڑا تھا- حرکت اور عمل کے اس وسیع سمندر میں جو رنگون سے پشاور تک پھیلا ہوا تھا ان کی اپنی ملت کا سفینہ پُر خروش لہروں کے رحم و کرم پر بہے چلا جا رہا تھا اس کشتی کا نہ کوئی کھیون ہار تھا اور نہ کوئی ساحلِ مراد-

<u>اہم موڑ اور نئی منزل</u> خلوص و ایثار اور عزم و ہمت کے اس پیکر نے جب صورتِ حال کا از سر نو جائزہ لیا اور اس کی نگاہوں نے تصویر کے اس رخ پر بھی نگاہ ڈالی تو اس کی نگاہیں وہیں جم کر رہ گئیں- کیا اس قابلِ رحم قوم کے لئے میرے ذمے کوئی فریضہ نہیں؟ یہ سوال پوری شدت سے ان کے ذہن میں ابھرا- ان کی آنکھوں میں آنسو آگئے- وہ زبان حال سے پکار اٹھے-------

آہ! میری قوم!!

یہ ذہنی تاثر اس قدر شدید تھا کہ کچھ مدت کے لئے ان کے قلب و نگاہ گویا منجمد سے ہو کر رہ گئے- سارے رہنما لندن کانفرنس سے عازم وطن ہو گئے- لیکن جناح! ایک گہری فکر کی استغراقی کیفیت چہرے پر لئے اور ہیجان واضطراب کے سینکڑوں طوفان سینے میں سمائے وہیں لندن کے ایک گوشے میں وقفِ سکون ہو کر رہ گئے- ایک تقریر میں اپنی اس کیفیت کو بے نقاب کرتے ہوئے------ بلکہ یوں سمجھئے کہ ماضی کی ناکامیوں کا صاف صاف اعتراف کرتے ہوئے------ انہوں نے کہا تھا-

> اس وقت میرے احساسات پر قنوطیت چھا گئی تھی- میرے جذبات پر مایوسیاں منڈلا رہی تھیں- میں اپنے ملک سے ناامید ہو گیا تھا- صورت حال انتہائی بدنصیبوں کی مظہر تھی- مسلمان بے یارومددگار کھڑے تھے- ان کا کوئی پُرسانِ حال ہی نہ تھا- کبھی دولت برطانیہ کے کاسہ لیس ان کی قیادت سنبھال لیتے اور کبھی کانگریس کے حاشیہ بردار اُن کی نمائندگی کے مدعی بن جاتے _ جب بھی انہیں متحد اور منظم کرنے کی کوئی کوشش ہوئی سرکار کے ٹوڈیوں اور کانگریس کیمپ کے ضمیر فروشوں ـ نے ان کی کوششوں کو ناکام بنا دیا- مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں نہ تو ہندوستان کی کوئی مدد کر سکتا ہوں اور نہ ہندو کی ذہنیت بدل سکتا ہوں اور نہ مسلمانوں کو ان کی نازک حالت کا یقین دلا سکتا ہوں- یہ احساس بیچارگی اس قدر بڑھا کہ میں لندن میں ہی اقامت گزیں ہو کر رہ گیا- اس لئے نہیں کہ مجھے ہندوستان سے محبت نہیں رہی تھی بلکہ مجھے اپنی بے بسی کا پورا احساس ہو گیا تھا-
>
> (تقاریر جناح)

1930ء سے 1934ء تک وہ چار سال انگلستان میں رہے۔ اس دوان میں وہ ملی صورت حال سے پوری طرح باخبر رہے۔ لیکن عملی سیاسیات سے ایک طرح کا تعلق منقطع رکھا اور اس ساعت سعید کے بے تابی سے منتظر رہے جب وہ اپنی ملت کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو ساحل مراد تک پہنچانے کے قابل ہو سکیں۔

صوبہ جاتی خود مختاری کا نیا مرحلہ اور انگلستان سے واپسی لندن کی ہر سہ کانفرنسوں کے بعد آخر وہ وقت آگیا جب جناح نے دس کروڑ اسلامیان ہند کی ناخدائی کے لئے ہندوستان کا رخ کیا اور ہندوستان کے مطلع سیاست پر آفتاب بن کر جلوہ بار ہو گئے۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء نے ملک کے سامنے صوبجاتی خود مختاری ATONOMY PROVINCIAL کی نئی منزل پیش کی۔ دس کروڑ بے یارو مددگار مسلمانون کی نگاہیں رہ رہ کر ان کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ علامہ اقبالؒ اور دیگر عمائدین ملت نے انہیں تار ارسال کئے اور ملت کی عزت و حرمت کا واسطہ دے کر انگلستان سے واپس پہنچنے کی اپیل کی۔ پیکر ایثار جناح قوم کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے اپنے وطن کو روانہ ہو پڑے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے مسلم لیگ کو متحرک اور صحت مند سیاسی نظام میں تبدیل کرنے کی جدوجہد شروع کی اور پھر اسلامیان ہند سے اپیل کی کہ صورت حال کی نزاکت کا احساس کرتے ہوئے ایک جسد واحد کی طرح اس کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں۔

قومی تنظیم کا عزم بلند ملم لیگ کی تطہیر اور تنظیم جدید بجائے خود ایک کٹھن اور صبر آزما مرحلہ تھا۔ نئے انڈیا ایکٹ کے تحت ملک کے عام انتخابات قریب آچکے تھے۔ کانگریس پوری طرح منظم اور کیل کانٹے سے لیس ہو چکی تھی۔ مسلمانوں میں چاروں طرف انتشار کا دور دورہ تھا۔ کچھ برطانوی سامراج کی حاشیہ برداری کو وظیفہ زندگی بنا چکے تھے۔ کچھ مقدس جبوں میں لپٹے ہوئے "امام الہند" اور "شیخ الہند" تھے جنھوں نے واردھا آشرم اور آنند بھون سے رشتہ وفا استوار کر رکھا تھا۔ وقت کا ایک ایک لحہ قیمتی تھا۔ جناح نے بڑے بڑے شہروں کا دورہ کیا۔ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے افراد ملت کو دعوت تنظیم دی۔ پارلیمنٹری بورڈ قائم کیا۔ لیکن وقفہ اتنا مختصر تھا کہ 1937ء کے صوبائی انتخابات میں جو نتائج سامنے آئے وہ بڑی حد تک امید افزا نہیں تھے۔ کانگریس نے گیارہ میں سے سات صوبوں میں اکثریت حاصل کی اور وہاں اپنی وزارتیں قائم کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ مسلم لیگ کو بنگال اور سندھ میں خالص مسلم لیگی وزارتیں قائم کرنے کا موقع مل سکا۔ لیکن قافلہ سالار منزل مقصود تک پہنچنے کا عزم کر چکا تھا۔ اس نے اپنی جان توڑ جدوجہد جاری رکھی۔

اسی دوران میں اقبالؒ و جناحؒ میں وہ تاریخی خط و کتابت ہوئی جس میں نہ صرف مستقبل کے قومی سفر کی راہ متعین کی گئی بلکہ اس سفر کے نشان راہ بھی۔ انہی میں سے 11 جون 1937ء کے ایک مکتوب میں علامہ موصوف نے جناب جناح کو خراج اعتماد پیش کرے ہوئے یہ لکھا تھا۔۔۔۔

ہندوستان میں آپ ہی کی ذات ایسی ہے جس سے قوم کو یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق حاصل ہے کہ

مستقبل میں جو سیلاب آنے کا خدشہ ہے اس میں صرف آپ ہی ملت کی صحیح رہنمائی کر سکیں گے۔

لکھنؤ کا سالانہ اجلاس اب جناح پوری ملت کی نگہ امید کے مرکز تھے۔ ملت اپنی عقیدت اور اعتماد کے اظہار میں انہیں "قائداعظم" کے خطاب سے معنون کر چکی تھی۔ ان کی آواز کروڑوں دلوں کی ترجمان تھی۔ مرکزی اسمبلی میں ان کی دھواں دھار تقریریں سامراج اور کانگریس کے نمائندوں کے لئے ایک مستقل چیلنج کی شکل اختیار کر گئیں اور قومی اسٹیج سے ان کے نعرۂ ہائے حریت نے پورے ملک کی فضا میں ایک ارتعاش سا پیدا کر رکھا تھا۔ اسی دوران میں لکھنؤ میں (اکتوبر 1937ء میں) مسلم لیگ کا وہ بے مثال سالانہ اجلاس ہوا جس کے جاہ و جلال اور کروفر نے مخالفین کی صفوں میں زلزلہ ڈال دیا۔ یہی اجلاس تھا جس میں پنجاب کے یونینسٹ وزیراعظم سر سکندر حیات اور بنگال کی کرشک پرجا پارٹی کے قائد اور وزیر اعظم مولوی ابوالقاسم فضل الحق اپنے وزراء سمیت بہ نفس نفیس شریک ہوئے۔ اور آل انڈیا سیاسیات میں اپنی وفاؤں کی نذر قائداعظم کے حضور پیش کر دی۔

لکھنؤ کے قومی اجتماع نے واردھا اور آنند بھون کے سامریوں کے سارے طلسم توڑ کر رکھ دیئے۔

اسی اجلاس سے متاثر ہو کر یو پی کے ایک دور اندیش کانگریسی رہنما ڈاکٹر محمود اللہ نے کہا تھا---

> اس وقت دو بڑی ایشیائی تہذیبوں کے تصادم کا فوری اور ہولناک امکان ہے۔ مسلم لیگ نے مسلمانوں کو جنگ کی دعوت دی ہے اور مسلمان کسی چیز سے اتنا خوش نہیں ہوتا جتنا جنگ کرنے سے۔
>
> (مسلمانوں کا ماضی' حال اور مستقبل)

یہ اجلاس اسلامیان ہند کی قومی زندگی میں نشاۃ ثانیہ کا ایک انقلاب آفریں موڑ ثابت ہوا۔ ملت کے قلب کی گہرائیوں سے امنگوں اور آرزوؤں کا ایک نیا چشمہ پھوٹ پڑا۔ ان کے خون میں باز آفرینیوں کی ایک نئی لہر موجزن ہو گئی۔ یوں سمجھئے کہ مدتوں کے بعد انہوں نے اپنی گم گشتہ منزل کو پا لیا------- اپنے آپ کو پالیا۔

اب یہ قافلہ ایک نئے عزم اور نئے ولولوں سے آگے بڑھ رہا تھا۔ مسلمانان ہند اپنی اجتماعی بقاء کے لئے اب مردانہ وار اور پوری یکجہتی و ہم آہنگی سے اپنے دشمنوں کے بالمقابل نبرد آزما تھے۔ ان کی صفوں میں پہلی بار مدت کے بعد نظم و ضبط کی حوصلہ افزا کیفیت نظر آ رہی تھی۔ اور اسی کا صدقہ تھا کہ انہوں نے اپنے دشمنوں کی شاطرانہ چالیں۔ مکروہ سازشیں اور ناپاک منصوبے خاک میں ملا دیئے۔

پاکستان کی تحریک کا آغاز اجلاس لکھنؤ کے کوئی ڈھائی برس بعد لاہور میں (مارچ 1940ء) آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک سالانہ اجتماع ہوا۔ قائداعظم نے اس اجلاس کی صدارت فرمائی۔ اور پہلی بار قرارداد پاکستان کے ذریعے حق خود اختیاری اور استقلال کی منزل مقصود کی طرف قومی سفر کا آغاز کیا۔ قرار داد لاہور ایک بانگ رحیل تھی جس کی آواز سنتے ہی ہماری ملت کا

قافلہ سامان سفر باندھ کر رواں دواں آگے بڑھا اور بالآخر سات برس بعد اس نے منزل مقصود پر اپنی فتح و کامرانی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ مارچ 1940ء سے اگست 1947ء تک اس صبر آزما سفر کے دوران بڑے بڑے نازک مرحلے ملت کے سامنے آئے۔ بڑے بڑے عیار اور مکار دشمنوں سے ٹکراؤ ہوا۔ بڑی بڑی خطرناک سازشوں سے الجھنا اور بڑی بڑی ابتلاؤں اور آزمائشوں سے گذرنا پڑا۔ لیکن قائداعظم کی قیادت وہ یگانہ روزگار اور عظمت آفریں قیادت تھی جس کے مقابلے میں مشکلات و موانعات کے پہاڑ پانی ہو کر بہہ گئے۔ ابتلا و آزمائش کے طوفان گرد کی طرح بیٹھ گئے اور ملت اس جاہ و جلال سے پاکستان کی منزل مراد تک پہنچی کہ دنیا کے طول و عرض سے بے ساختہ تحسین و آفریں کے نعرے بلند ہوئے اور مشرق و مغرب نے برملا شہادت دی کہ قائداعظمؒ بلا ریب اس دور کے ایک عظیم ترین سیاست دان تھے۔

دنیا کے عظیم ترین اخبار "لندن ٹائمز" نے لکھا

> انہوں نے اپنی ذات کو ایک بہترین نمونہ پیش کر کے اپنے اس دعوے کو ثابت کر دیا کہ مسلمان ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ان میں وہ ذہنی لچک نہیں تھی جو انگریز کے نزدیک ہندوستانیوں کا خاصہ ہے۔ ان کے تمام خیالات ہیرے کی طرح قیمتی مگر سخت' واضح اور بین ہوتے تھے۔ ان کے دلائل میں ہندو لیڈروں ایسی حیلہ سازی نہ تھی بلکہ وہ جس نقطہ نظر کو ہدف بناتے تھے اس پر براہ راست نشان باندھ کر وار کرتے تھے۔ وہ ایک ناقابل تسخیر حریف تھے۔

آقائے علی اصغر حکمت سفیر ایران نے خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا۔۔۔۔

> ایسے عظیم الشان انسان آسمان کے ان ستاروں کی مانند ہیں جن کی روشنی ہم تک بعید از قیاس فاصلے طے کر کے پہنچتی ہے اور اگرچہ وہ انسانوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں لیکن ان کے نور سے ہمیشہ کسب فیض کیا جا سکتا ہے۔ قائداعظم کی شخصیت آئندہ نسلوں کے لئے مینارۂ نور کا کام دیگی۔

بلبل ہند سروجنی نائیڈو ان کی عظمت پر نذر عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتی ہیں۔

> زندگی کے حقائق کو جانچنے' پرکھنے اور تسلیم کرنے میں بلا کے محتاط اور غیر جانبدار معاملات میں سوجھ بوجھ اور سلامت روی کے مظہر۔ مگر حقیقی مقصد کے لئے ناقابل شکست چٹان۔

سی۔ آر۔ داس کے الفاظ سنیئے۔۔۔۔۔۔

> مسٹر جناح صرف مسلمانوں ہی کی نجی دولت نہیں۔ وہ پورے ہندوستان کے لئے سرمایہ افتخار ہیں۔

سابق وزیراعظم انڈونیشیا سلطان شہریار نے کہا تھا۔۔۔۔۔۔

> مسٹر جناح بے حد پرکشش انسان ہیں۔۔۔ ایک مقناطیسی کشش۔۔۔ ان کی آواز میں صداقت اور خلوص کی ایسی قوت کارفرما نظر آتی ہے جو میں نے بہت کم زعماء میں دیکھی ہے۔۔۔ بہت ہی کم زعماء میں۔۔۔۔۔ میں عصر حاضر کے اکثر زعماء سے ملا ہوں۔ لیکن اپنے مافی الضمیر کے اظہار میں جتنی

کاملانہ قدرت قائداعظم کو حاصل ہے کسی دوسرے میں نظر نہیں آتی۔

سابق صدر امریکہ مسٹر ٹرومین نے ان کی وفات پر کہا تھا-----

دولت پاکستان کا معمار-- دنیا کی سب سے بڑی اسلامی مملکت کا بانی۔ مجھے یقین ہے کہ مسٹر جناح کی غیر معمولی قیادت کی یاد حکومت پاکستان اور اس کے عوام کے لئے مشعل راہ ثابت ہو گی۔

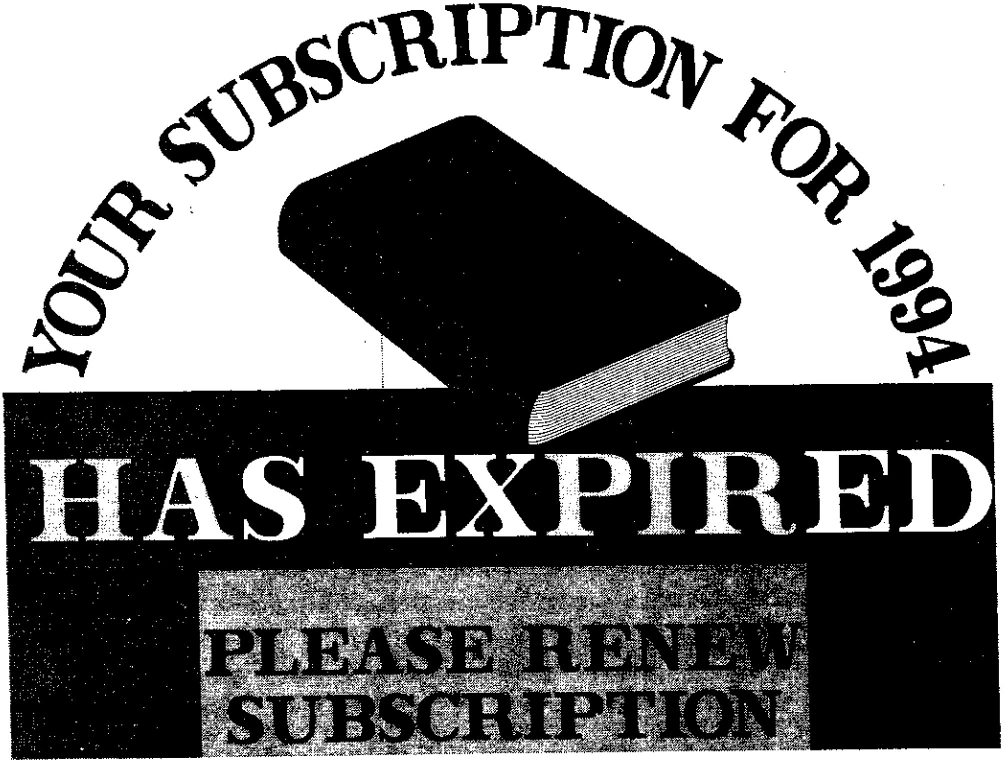

(بر)گیڈیئر ریٹائرڈ
(ا)عزازالدین احمد خاں
73 ای۔ ڈیفنس سوسائٹی
لاہور چھاؤنی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہماری نظریاتی بنیادوں کو کھوکھلا کیا جا رہا ہے

سینٹر ڈاکٹر جاوید اقبال کے مقالے پر ایک تبصرہ

تمہید

علامہ اقبالؒ نے کہا تھا:-

اسی کش مکش میں گزریں میری زندگی کی راتیں!
کبھی سوز و ساز رومی' کبھی پیچ و تاب رازی

لیکن ایسا نظر آتا ہے کہ ہم (اہل پاکستان) کی راتیں ہی نہیں' بلکہ پوری زندگی اس قسم کے سوال و جواب میں گزر جائے گی کہ ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا۔ اس مطالبہ کا جذبہ محرکہ کیا تھا۔ اس کی اساس و بنیاد کیا تھی۔ اس سے مطلوب و مقصود کیا تھا؟ ستم ظریفی یہ ہے کہ اس قسم کے سوالات درحقیقت موجود نہیں۔ انہیں پیدا کیا جاتا ہے جیسا کہ جناب جسٹس (ریٹائرڈ) سینٹر ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے اپنے مقالے "قائداعظم کا متصائے نظر: سیکولر ریاست یا روحانی جمہوریت" میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ روزنامہ "نوائے وقت" لاہور (13 اکتوبر 94ء) کے مطابق یہ مقالہ ڈاکٹر صاحب' نے مادر ملت تقریبات کمیٹی کے زیر اہتمام ایک اجتماع میں پڑھا۔ میں نے اس مقالے کو کئی بار پڑھا اور ہر بار یہی تاثر ملا کہ جیسے ڈاکٹر صاحب مخلوط انتخابات کے لئے زمین ہموار کر رہے ہوں۔ اور چونکہ اس مقصد کی راہ میں قرآن حکیم کا پیش کردہ "دو قومی نظریہ" حائل ہے اس لئے ڈاکٹر صاحب نے اس ابدی حقیقت کو ہندوستان کی ہنگامی سیاست کا حصہ قرار دے کر اس میں ردوبدل کی گنجائش نکالنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ نہ سوچا کہ ایسا کرنے سے ہماری نوجوان نسل کے دل میں پاکستان قائم کرنے کی وجہ جواز کے بارے میں شکوک پیدا ہو سکتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اگر کسی مملکت کے جواز کے بارے میں شکوک پیدا ہو جائیں تو اس کا استحکام متزلزل ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے سوالات کو وقتاً" فوقتاً" وہ عناصر

ابھارتے رہتے ہیں جنھوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی لیکن ڈاکٹر صاحب تو اپنے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کو تو سمجھنا چاہئے کہ جب درخت جڑ بنیاد سے اکھڑ گیا تو اس کے پھل ان کی جھولی میں کس طرح گریں گے؟

آیئے ڈاکٹر صاحب کے ارشادات پر ایک نظر ڈالیں۔

دو قومی نظریہ

اپنے مقالہ میں ڈاکٹر صاحب' نے منجملا اور باتوں کے' پاکستان کی اساس و بنیاد' دو قومی نظریہ' کے بارے میں اپنی تھیوری پیش کی ہے جسے پڑھ کر مجھے شدید دکھ ہوا۔ فرماتے ہیں۔

> "...... چند بزرگوں نے مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخابات کا مطالبہ کیا جو انگریز حکمرانوں نے مان لیا۔
> اس طرح ہندوستان میں جداگانہ انتخابات مسلمانوں کے سیاسی تشخص کی بنیاد بن گئے اور جداگانہ انتخابات ہی کے ذریعے مسلمانوں میں دو قومی نظریہ یا مسلم قومیت کا شعور پیدا ہوا۔"

اب آپ ہی کہئے "تیرا مسلمان کدھر جائے"

نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ :-

> "نظریہ کا تعلق فکر سے ہوتا ہے لیکن جب فکر کو عملی جامہ پہنایا جانے لگے تو تخیل اور حقیقت میں
> تصادم یا تاریخ کی مجبوریوں کے سبب اس میں ردوبدل کرنے کی ضرورت پڑ جاتی ہے۔"

انسانوں کے خود ساختہ "فکر" کی حد تک تو ڈاکٹر صاحب کا ارشاد درست ہے لیکن اگر اس کی لپیٹ میں قرآن حکیم کا عطا کردہ فکر "دو قومی نظریہ" کو بھی لے لیا جائے تو کہنا پڑے گا "مجھے بتا تو سہی اور کافری کیا ہے" ڈاکٹر صاحب کا مسئلہ یہ ہے کہ "دو قومی نظریہ" میں ردو بدل کئے بغیر مخلوط انتخابات کے لئے جواز پیدا نہیں کیا جا سکتا۔

بظاہر ایسا نظر آئے گا کہ دو قومی نظریہ کا مسئلہ ہنگامی سیاست سے متعلق ہے جس کا فیصلہ ہمیں اپنی سیاسی مصلحتوں کے مطابق کر لینا چاہیے۔ لیکن' جیسا کہ آپ دیکھیں گے' اس مسئلہ کا تعلق ہماری ہنگامی سیاست سے نہیں۔ یہ قرآن کی پیش کردہ ابدی حقیقت ہے اور دین کا اصل الاصول۔ علامہ اقبالؒ نے اسے اسی حیثیت سے پیش کیا اور اس کی بنیادوں پر مملکت پاکستان کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ظاہر ہے کہ جس طرح کسی عمارت کے استحکام کا انحصار اس کی بنیاد پر ہوتا ہے؟ اسی طرح مملکت پاکستان کی سالمیت کا دارومدار اسی نظریہ پر ہے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے یہ ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ "دو قومی نظریہ" سے مراد اتنی ہی نہیں کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو قومیں بستی تھیں۔ "دو قومی نظریہ" اسلام کی بنیادی تعلیم اور ایک ابدی صداقت ہے جس کا اعلان اس دن ہوا' جب اللہ تعالیٰ کے پہلے رسول' حضرت نوحؑ نے' سب سے پہلی مرتبہ' دین خداوندی کو دنیا کے سامنے پیش

کیا۔ اس کے بعد ہر رسول اس مصداق کو دہراتا رہا۔ تاآنکہ اسے قرآن حکیم کی دفتین میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا گیا۔ غیر منقسم ہندوستان میں ہم نے "دو قومی نظریہ" کی اصطلاح اس لئے بھی اختیار کی تھی کہ ہندوؤں کا دعویٰ تھا کہ ہندوستان میں صرف ایک قوم بستی ہے اور ہمارا دعویٰ یہ تھا کہ وہاں ایک قوم نہیں بستی' دو قومیں بستی ہیں۔ ایک قوم مسلمانوں پر مشتمل ہے اور دوسری قوم وہاں کے غیر مسلم باشندوں پر ہمارے اس دعویٰ کی بنیاد و اساس "دو قومی نظریہ" ہی تھا۔ یہ ابدی صداقت یہ ہے کہ پیدائش کے اعتبار سے' صرف انسان پیدا ہوتے ہیں۔ پھر وہ نظریہ زندگی کے معیار کے مطابق دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں۔ ایک گروہ وہ جو وحی خداوند کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتا ہے (مومنین) اور دوسرا وہ جو اس نہج کی زندگی کو تسلیم نہیں کرتا۔ (کافر)

قرآن حکیم کے الفاظ ہیں :-

هو الذی خلقکم فمنکم کافر و منکم مومن ○ (64:2)

"اللہ نے تمہیں انسانی پیکر عطا کیا جس کی خصوصیت کبریٰ یہ ہے کہ تمہیں اختیار وارادہ کی استعداد حاصل ہے۔ انسان کی اس استعداد کا نتیجہ یہ ہے کہ) تم میں بعض کافر ہو گئے اور بعض مومن بن گئے" -

لہذا' قرآن حکیم کی رو سے دنیا میں قومیں دو ہی ہیں۔ ایک وہ قوم جو اس ایمان کی رو سے وجود میں آئے اور دوسری ان کی جو ان میں شامل نہ ہوں۔ اس سی واضح ہے کہ جس طرح یہ تصور اسلام کے خلاف ہے کہ مسلم اور غیر مسلم مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں' اسی طرح یہ مسک بھی یکسر خلاف اسلام ہے کہ مسلمان' رنگ' نسل' زبان اور وطن کے اختلاف سے مختلف قوموں میں بٹ سکتے ہیں۔ اور اسی سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ "دو قومی نظریہ" کسی انسانی ذہن کی تخلیق نہیں۔ یہ اس دین کا اساسی جزو ہے جسے اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی عطا فرمایا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے اس نظریہ کو پیش کیا تھا' تخلیق نہیں کیا تھا۔ اقبالؒ کا پیغام یہ تھا۔

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے

اسلام کا اصول قومیت یہ ہے کہ تمام دنیا کے مسلمان خواہ وہ کسی خطہ زمین میں بستے ہوں' ایمان کے اشتراک کی بنا پر ایک قوم کے افراد ہیں۔ محض ایک قوم کے افراد نہیں' ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

انما المومنون اخوة (49:10)

"یاد رکھو! مومن سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں" -

اس اخوت کو اس نے کتاب اللہ سے وابستگی کا لازمی نتیجہ اور اللہ کی خصوصی نعمت قرار دیا ہے جب کہا کہ۔

فاصبحتم بنعمته اخوانا (3:102)

"اللہ نے تمہیں بھائی بھائی بنا دیا اور یہ اس کا خاص انعام تھا۔"

صدر اول میں' اسی نظریہ کی بنا پر دو قوموں کا وجود عمل میں لایا گیا۔ ایک امت مسلمہ (یعنی تمام دنیا کے مسلمان ایک قوم) اور دوسری ملت کافریہ یعنی تمام غیر مسلم' دوسری قوم)۔ کچھ عرصہ کے بعد' مسلمانوں کی گاڑی اسلام کو چھوڑ کر دوسری پٹڑی پر جا پڑی اور امت ذلیل و خوار ہو گئی۔ صدیاں گزر گئیں تاآنکہ علامہ اقبالؒ نے صدر اول کے صحیح اسلام کا تصور مسلمانوں کے سامنے پیش کیا اور چاہا کہ ایک ایسا خطہ زمین حاصل ہو جائے جس میں اس تصور کو عملاً" متشکل کر کے احیاء اسلام کی تحریک کا آغاز کر دیا جائے۔

اس تجربہ کی ابتدا کرنے کے لئے ہم نے "دو قومی نظریہ" کا نعرہ ہندوستان میں بلند کیا تھا اس سلسلہ میں ہمارا پہلا مطالبہ' مسلمانوں کی جداگانہ مملکت کی تشکیل نہیں تھا بلکہ اس حقیقت کو تسلیم کرانا تھا کہ مسلمان' ایمان کے اشتراک کی بنا پر' ہندوستان کے غیر مسلموں سے الگ' مستقل بالذات' قوم ہیں۔ قائداعظم سے پوچھا جاتا تو وہ فرماتے کہ اگر مسلمانوں کو ایک جداگانہ قوم تسلیم کرا لیا گیا تو ان کے لئے ایک جداگانہ مملکت کا قیام اس کا منطقی اور لازمی نتیجہ ہو گا۔ اس لئے ہمیں سب سے پہلے اس بنیادی مطالبہ پر زور دینا چاہئے۔ یہ ہے ہندوستان میں مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخابات کے مطالبہ کا صحیح تاریخی پس منظر۔ تعجب ہے کہ فرزند اقبال اس پس منظر سے واقف نہیں ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا کہ "جداگانہ انتخابات ہی کے ذریعہ مسلمانوں میں دو قومی نظریہ یا مسلم قومیت کا شعور پیدا ہوا" نہ صرف تاریخی اعتبار سے غلط ہے بلکہ دین کی اصل و حقیقت سے ان کی لاعلمی کی نشاندہی بھی کرتا ہے سن رکھئے کہ "دو قومی نظریہ" نہ تو ہندوستانی باشندوں کی نسبت سے وجود میں آیا تھا اور نہ ہی یہ تحریک یا مطالبہ' پاکستان کی پیداوار ہے۔ یہ اسلام کی ایک ابدی حقیقت ہے۔ جب تک دنیا میں ایک شخص بھی مسلم رہے گا' "دو قومی نظریہ" زندہ رہے گا۔ قرآن حکیم کی رو سے دنیا کے تمام مسلمان' ایمان کے اشتراک کی بنا پر' قوم کے افراد ہیں اور یہ کہ کوئی غیر مسلم اس مسلم قوم کا فرد قرار نہیں پاسکتا خواہ وہ (غیر مسلم) مسلمانوں کی مملکت کے اندر ہی کیوں نہ رہتا ہو۔ اس لئے مسلم قوم میں مخلوط انتخابات کا کیا سوال۔

مخلوط انتخابات

لیکن ڈاکٹر صاحب نے مخلوط انتخابات کے سوال کو بھی اپنے مقالے میں اٹھایا ہے۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں ڈاکٹر صاحب کے مقالے کا بظاہر مقصد پاکستان میں مخلوط انتخابات کے لئے زمین ہموار کرنا ہے' چاہے اس سے ہمارے تصورات حیات اور نظریات زندگی بے یقینی کا شکار ہی کیوں نہ ہو جائیں۔ وہ مخلوط انتخابات کے لئے تائید و حمایت حاصل کرنے کے لئے نہ صرف ایسے بیانات علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ سے منسوب کرتے ہیں جن پر مزید غور و فکر کی ضرورت

ہے بلکہ حضور نبی اکرمؐ کے عہد میں تحریر کردہ یہود سے پہلا معاہدہ' "میثاق مدینہ" کو مخلوط انتخابات کے لئے بطور شہادت پیش کرتے ہیں۔ اس کی طرف میں ابھی آتا ہوں۔ پہلے علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ سے منسوب کردہ بیان سن لیجئے۔ فرماتے ہیں۔

"یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ علامہ اقبال جداگانہ انتخابات کو صحیفہ آسمانی نہ سمجھتے تھے"۔

یاد رہے علامہ اقبالؒ نے مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت کو قرآن حکیم کی پیش کردہ ابدی صداقت' "دو قومی نظریہ" کی روشنی میں کیا تھا!

ڈاکٹر صاحب مزید فرماتے ہیں کہ۔

"پس کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے مسلم قومیت کی شناخت بن جانے پر قائداعظم اور علامہ اقبال کی سوچ یہ تھی کہ یہاں مخلوط انتخابات رائج کرنے میں کوئی حرج نہ ہو گا"۔

ڈاکٹر صاحب نے یہ نہیں فرمایا کہ قائداعظؒ اور علامہ اقبالؒ کی "سوچ" میں پاکستان میں کیسی حکومت کا تصور تھا۔ اسلامی مملکت یا سیکولر سٹیٹ تاکہ انتخابات کے بارے میں صورت واضح ہو جاتی۔

سیکولر سٹیٹ میں' سٹیٹ کی حدود میں بسنے والے تمام باشندے (مسلم اور غیر مسلم) ایک قوم ہوتے ہیں۔ اور ایک قوم میں جداگانہ انتخابات کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اور اسلامی مملکت میں۔

1- مملکت صرف مسلمانوں کی ہوتی ہے' مسلم اور غیر مسلمون کی مخلوط نہیں ہوتی۔ **لیستخلفنهم فی الارض** (24:55) کی قرآنی نص صریح اس کی شاہد ہے۔

2- اس مملکت میں معاملات صرف مسلمانوں کے باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں۔ **امر هم شوری بینهم** (42:38) میں "**بینهم**" (ان کے اپنے باہمی مشورہ سے) کی شرط بڑی اہم اور بنیادی ہے۔ علاوہ ازیں قرآن حکیم بالفاظ صریح کہتا ہے کہ غیر مسلموں کو اپنے رازوں میں شریک مت کرو۔ (3:117)

3- اسلامی مملکت کے جملہ امور' حدود اللہ کے اندر رہتے ہوئے سر انجام پاتے ہیں' اس لئے غیر مسلم' جو حدود اللہ پر ایمان ہی نہیں رکھتے' اس کے شریک حکم نہیں ہو سکتے۔

لہٰذا اسلامی مملکت میں قوم ایک ہی ہوتی ہے' یعنی مسلمانوں کی۔ غیر مسلم' اس قوم کے افراد نہیں ہوتے (یہی دو قومی نظریہ کا تقاضا ہے) غیر مسلموں کی حیثیت ایک (Community) سوسائٹی کی ہوتی ہے جن کے جان۔ مال۔ عزت۔ آبرو۔ مذہب۔ معابد کی حفاظت کی ذمہ داری اسلامی مملکت کی ہوتی ہے۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ اسلامی مملکت میں ووٹ کے اہل صرف مسلمان ہوتے ہیں' اس لئے مخلوط انتخابات کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

میں، ڈاکٹر صاحب اور دیگر ان ارباب سیاست سے، جو جداگانہ یا مخلوط انتخابات کا سوال ابھارتے رہتے ہیں، گذارش کرونگا کہ وہ دو ٹوک الفاظ میں واضح کریں کہ وہ پاکستان کو کیسی مملکت سمجھتے ہیں۔ سیکولر یا اسلامی۔ اس جواب کی روشنی میں انہیں اس مسئلہ کا واضح جواب مل جائے گا۔

جہاں تک قائداعظمؒ کا تعلق ہے وہ تحریک پاکستان کے یوم اول سے لے کر اپنی زندگی کے آخری سانس تک "دو قومی نظریہ" کی حامی رہے۔ یہ اس لئے کہ وہ اسے اسلام کا بنیادی اور مملکت پاکستان کے جواز کی خشت اول سمجھتے تھے۔ ان کے اور مخالفین مطالبہ پاکستان کے مابین جنگ کی وجہ یہی تھی کہ قائداعظم اسلامی مملکت متشکل کرنا چاہتے تھے اور مخالفین پاکستان (ہندو اور نیشنلسٹ علماء) سیکولر سٹیٹ کے حامی تھے۔ شدید مخالفت کے باوجود، قائداعظم مطالبہ پاکستان باصرار و تکرار پیش کرتے چلے گئے۔ انہوں نے اس مطالبہ کا آغاز ایک ایسی حقیقت سے کیا۔ اور ایسے انداز میں کیا جو جامعیت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہے۔ انہوں نے 8 مارچ 1944ء کو مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

"پاکستان کا آغاز تو اس دن ہو گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا غیر مسلم، اسلام قبول کر کے مسلمان ہوا تھا، حالانکہ اس وقت ہنوز مسلمانوں کی کوئی حکومت یہاں قائم نہیں ہوئی تھی"۔

وہ غیر مسلم جب مسلمان ہوا تو پہلی قوم کا فرد نہیں رہا۔ وہ ایک جداگانہ قوم کا فرد ہو گیا۔ ہندوستان میں ایک نئی قوم وجود میں آگئی۔ اور جب ایک نئی قوم وجود میں آگئی تو اس کے لئے ایک الگ مملکت کی ضرورت بھی مسلم ہو گئی اس طرح پاکستان کی پہلی اینٹ اس دن رکھی گئی جب یہاں پہلا غیر مسلم مسلمان ہوا تھا۔

آپ نے غور فرمایا کہ پاکستان کے مطالبہ کا جذبہ محرکہ کیا تھا؟ مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ، جواز کیا تھی؟ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ نہ ہندو کی تنگ نظری تھی نہ انگریز کی چال۔ یہ اسلام کا بنیادی مطالبہ تھا۔ یہ "دو قومی نظریہ" کا تقاضا تھا۔ سوچئے! اگر مسلم اور غیر مسلم ہندوستان میں دو الگ الگ قومیں تھیں تو پاکستان میں آکر وہ (مسلم اور غیر مسلم) ایک قوم کیسے بن سکتے ہیں یاد رکھیئے کہ "دو قومی نظریہ" اسلام کا ایک غیر متبدل اصول ہے جس میں کوئی ردوبدل ممکن نہیں۔۔ "میثاق مدینہ" کے ذریعہ بھی نہیں

میثاق مدینہ

ڈاکٹر صاحب نے، "میثاق مدینہ" کو مخلوط انتخابات کے لئے بطور شہادت پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

"آنحضورؐ نے مدینہ میں اسلامی ریاست کے قیام کے بعد جو دنیا کا پہلا تحریری آئین (یعنی میثاق مدینہ) نافذ کیا اس میں وادی یثرب کے مسلمانوں اور غیر مسلموں کو "امت الواحدہ" قرار دیا تھا"۔

ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں مودبانہ گذارش ہے کہ یہ معاہدہ (میثاق مدینہ) تو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ یہ مسلم اور

غیر مسلموں کے ضم وادغام سے' ایک متحدہ قومیت کی تکوین نہیں بلکہ ایک مشترکہ مقصد میں باہمی رضا مندی سے متحدہ محاذ قائم کرنے کی صورت تھی اور وہ بھی اس شکل میں کہ مسلمانوں کا ہاتھ بہرکیف غالب رہے۔ بعض لوگ اپنے دعویٰ کی دلیل میں یہ چیز پیش کرتے ہیں کہ اس معاہدہ کے سرنامہ کے بعد یہ بھی مذکور ہے کہ۔

"انھم امتً واحدۃ من دون الناس"

(یہ باہمی معاہدہ کرنے والے لوگ' دوسروں کے مقابلہ میں ایک جماعت ہونگے)

اس لئے مسلم اور غیر مسلم مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں۔ اس دلیل کی عنکبوتیت واضح ہے۔ "امتہ واحدۃ" سے مفہوم ایک فریق (One party) ہے نہ کہ قوم (Nation) جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ حضرات انبیاء کرامؑ کی دعوت کی اساس و بنیاد اس اہم اصول پر ہوتی ہے کہ قومیت کا امتیاز کفر اور اسلام ہے۔ اس تمام تعلیم کے مقابلہ میں' اس معاہدہ کے الفاظ "امتہ واحدۃ" سے یہ دلیل لانا کہ مسلم و غیر مسلم مل کر ایک قوم بن سکتے ہیں' قرآن کی بنیادی تعلیم کے خلاف ہے۔ (64:2) یہ بھی یاد رہے کہ یہ معاہدہ تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے۔ نبی اکرمؐ کی سیرت مقدسہ کا آئینہ قرآن حکیم ہے۔ تاریخ کے واقعات کو اس کے تابع رکھنا ہو گا۔ اگر کوئی روایت قرآن کے خلاف جائے گی تو قرآن کو صحیح اور تاریخی روایت کو مشتبہ ماننا ہو گا۔ **وذلک دین القیم ولکن اکثر الناس لا یعلمون۔** (معراج انسانیت - پہلا ایڈیشن ص 379)

قائداعظم کی 11 اگست کی تقریر

ڈاکٹر صاحب اسی پر اکتفا نہیں کرتے وہ قائداعظمؒ کی 11 اگست 47ء کی تقریر کو "سیکولر دانشور" کے ذریعہ اس انداز میں پیش کرتے ہیں جس سے تاثر یہ ابھرے کہ قائداعظم پاکستان کو ایک سیکولر ریاست بنانا چاہتے تھے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ قائداعظمؒ نے بے شک "دو قومی نظریہ" ہندوستان میں پیش کیا تھا۔ لیکن انہوں نے تشکیل پاکستان کے فوری بعد 11 اور 14 اگست 47ء کی اسمبلی کی تقاریر میں کہہ دیا تھا کہ یہاں مسلم اور غیر مسلم ایک ہو کر رہیں گے اور اس طرح انہوں نے " دو قومی نظریہ" پر خود ہی خط تنسیخ کھینچ دیا تھا! قائداعظم کی 11 اگست 47ء کی تقریر کے الفاظ یہ تھے۔

"میں سمجھتا ہوں کہ ہمیں اپنے سامنے یہ نصب العین رکھنا چاہئے کہ ایک وقت کے بعد یہاں نہ ہندو' ہندو رہے گا' نہ مسلمان' مسلمان۔ مذہبی نقطہ نگاہ سے نہیں۔ کیونکہ وہ تو ہر فرد کے ذاتی عقیدہ کا سوال ہے۔ ایسا' ان سب کے پاکستان کے شہری ہونے کی حیثیت سے' سیاسی نقطہ نگاہ سے ہو گا"

ذرا سوچئے کہ قائداعظمؒ کے ان الفاظ سے یہ مستنبط کرنا کہ جس نظریہ کی رو سے انہوں نے دس سال تک ہندو اور انگریز سے جنگ کر کے پاکستان حاصل کیا تھا' وہ اس نظریہ کو پہلے ہی دن اس طرح نذر آتش کر دیں گے' بڑی زیادتی

ہے۔ کوئی باہوش انسان اسے باور نہیں کرے گا۔ قائداعظم کی اس تقریر کا مقصد غیر مسلم اقلیتوں کو یقین دلانا تھا کہ ان سے رواداری اور حسن سلوک کا برتاؤ کیا جائے گا۔

میں ان حضرات سے، جو یہ سمجھتے ہیں کہ قائداعظمؒ نے اپنی 11 اگست 47ء کی تقریر میں "دو قومی نظریہ" کا ابطال کر دیا تھا، پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا وہ "دو قومی نظریہ" کو اسلام کا اصول مانتے ہیں یا اس سے انکار کرتے ہیں؟ اگر وہ اسے اسلام کا اصول تسلیم کرتے ہیں تو یہ سوال درخود اعتناء ہی نہیں ہونا چاہئے کہ کس نے اسے قبول کیا اور کس نے مسترد کر دیا۔ اور اگر وہ اسے اسلام کا اصول تسلیم نہیں کرتے تو پھر ان کو اپنے اس عقیدہ کی تائید میں قائداعظمؒ کو بطور سند پیش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ قائداعظمؒ کو ان کے حال پر چھوڑ دیجئے اور صاف صاف بتایئے کہ آپ "دو قومی نظریہ" کو مطابق اسلام سمجھتے ہیں یا متحدہ قومیت کو! یہ اس لئے کہ مملکت پاکستان کو اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اور آئین میں بھی اسے 'اسلامی' کہہ کر پکارا گیا ہے اس لئے یہاں، امور مملکت سے متعلق تمام باتیں، اسلام کے حوالے سے ہونی چاہئیں۔ فرمایئے ڈاکٹر صاحب! اسلام کے حوالے سے اس بارے میں آپ کا کیا مسلک ہے؟ "روحانی جمہوریت" کی اصطلاح کو بھی ہمیں "دو قومی نظریہ" کے تقاضوں کے مطابق پرکھنا ہو گا۔

روحانی جمہوریت

"روحانی جمہوریت" کی اصطلاح ڈاکٹر صاحب کے مطابق، برصغیر کے مسلم سیاسی لٹریچر میں صرف علامہ اقبالؒ نے ہی اپنی تحریروں میں استعمال کی ہے۔ اس کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ

> "ان کے (یعنی علامہ کے) نزدیک اسلامی ریاست وہی ہے جس میں انسانی اتحاد، انسانی مساوات، اور انسانی حریت کا دور دورہ ہو۔ "تشکیل جدید الہیات اسلامیہ" میں ایک اور مقام پر واضح کرتے ہیں کہ اسلام کا اصل مقصد روحانی جمہوریت کا قیام ہے...... اس سے مراد یہ ہے کہ ایسا جمہوری نظام جس میں "مذہب سے لاتعلقی" یا "جبر سے مذہب کے خاتمہ" کی بجائے "مذہب کا احترام" کیا جائے اور ہر مذہب کو آزادی حاصل ہو۔"

اگر "انسانی اتحاد" "انسانی مساوات" اور "مذہب کی آزادی" سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ مسلم اور غیر مسلم دو الگ الگ قومیں نہیں، بلکہ ایک قوم ہے، تو یہ تصور اسلام کے نظریہ قومیت کے یکسر خلاف ہے (64:2)، اور اسے علامہ اقبالؒ سے منسوب کرنا سنگین زیادتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھول رہے ہیں کہ علامہ کی نظر میں۔ "خاص ہے ترکیب میں قوم رسولؐ ہاشمی" اور "بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے۔" ہمارے "حصار ملت" کی "بنا" "دو قومی نظریہ" ہے۔

جیسا کہ ڈاکٹر صاحب جانتے ہیں ہمارے ہاں جو اسلام اس وقت بالعموم مروج ہے وہ بہ ہیئت مجموعی' ہمارے دور ملوکیت کا پیدا کردہ ہے۔ علامہ اقبالؒ یہ چاہتے تھے کہ اگر پاکستان کا خطہ زمین حاصل ہو جائے تو اس میں حقیقی اسلام کو پھر سے عملاً متشکل کیا جائے جو عہد محمدؐ رسول اللہ والذین معہؐ میں رائج تھا۔ اس طرح سے اسلام سے وہ "ٹھپہ" مٹ سکے گا جو اس پر عرب ملوکیت نے صدیوں سے لگا رکھا ہے۔ یعنی پاکستان ایک اسلامی مملکت ہو گا اور اس میں اسلام اپنی اصلی اور حقیقی شکل میں رائج ہو گا۔ یہ ہے علامہ اقبالؒ کے تصور کی اسلامی حکومت۔ اگر "روحانی جمہوریت" سے مراد اسلامی فلاحی مملکت کا قیام ہے تو یہ علامہ اقبالؒ کے تصور کے عین مطابق ہے اور اگر "روحانی جمہوریت" کی اصطلاح کا مقصد "دو قومی نظریہ" میں ردوبدل کی گنجائش نکالنا ہے تو یہ اسلام کی ابدی صداقت کے خلاف ایک بھونڈی سازش ہے۔ اس میں علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کو کسی بھی شکل و صورت میں ملوث کرنا سنگین زیادتی ہو گی۔ علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ سے یہ "سوچ" منسوب کرنا کہ:۔

"پاکستان میں مسلم قومیت کی شناخت بن جانے پر (یعنی شمالی مغربی صوبوں کی تشکیل نو کے بعد) قائد اعظم اور علامہ اقبال کی سوچ یہ تھی کہ یہاں مخلوط انتخابات رائج کرنے میں کوئی ہرج نہ ہو گا۔"

سراسر زیادتی ہے۔ اس "سوچ" پر' ان قائدین کے بیانات اور تحریروں کی روشنی میں' مزید ریسرچ اور غور و فکر کی ضرورت ہو گی۔ اسی طرح یہ جو سینٹر ڈاکٹر جاوید اقبال نے' مخلوط انتخابات کی حمایت حاصل کرنے کے لئے قرآن حکیم کی آیت 5:48 میں آئے ہوئے الفاظ :-

لکل جعلنا منکم شرعتہ و منھا جا

کو جو معنی پہنا رہے ہیں' وہ ان قرآنی الفاظ کا صحیح مفہوم پیش نہیں کرتے۔ اس آیت مبارکہ میں رب العزت نے کہا یہ ہے کہ دین کے اختیار کرنے پر ہم کسی پر جبر نہیں کرتے۔ جس جس طریق پر کوئی از خود چلتا ہے ہم اس کے اس اختیار و ارادہ میں دخل نہیں دیتے۔ ہمارا کام الدین دے دینا ہے۔ یہ انسانوں کی اپنی مرضی ہے کہ وہ الدین کو اختیار کریں یا اپنے اپنے طور طریقوں پر چلتے رہیں۔ (18:29) اس مفہوم کی تائید اس سے اگلی آیت سے ہوتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

و لو شاء اللہ لجعلکم امتہ واحدۃ (5:48)

اگر اللہ چاہتا تو تم سب کو ایک امت بنا دیتا۔ لیکن اس طرح تمہارا اختیار و ارادہ سلب ہو جاتا اور یہ چیز مشیت خداوندی کے خلاف ہوتی۔ اب آپ ہی کہئے اس آیت کو مخلوط انتخابات کے بطور دلیل پیش کرنا کہاں تک درست ہے۔ اصل یہ ہے کہ ہم لوگوں نے اسلام کے نام پر مملکت تو حاصل کر لی لیکن مملکت کا تصور ہمارے ذہنوں میں وہی مغربی سیکولر سٹیٹ ہے۔ قرآن حکیم اس قسم کی ثنویت (DUALISM) کو شرک قرار دیتا ہے۔ (4:48) اور یہی علامہ

اقبالؒ کے مشہور شعر "جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی" کا مفہوم ہے۔ یعنی پرائیویٹ زندگی کے اخلاق کا ضابطہ کچھ اور سیاست کے لئے ضابطہ کچھ اور' "جلال بادشاہی" اور "جمہوری تماشا" میں تو جائز ہو سکتا ہے لیکن قرآن حکیم کی نظر میں نہیں۔ قائد اعظمؒ اور علامہ اقبالؒ جیسے پائے کے قائدین کے بارے میں "دین اور سیاست" میں ثنویت کا تاثر دینا ان کو قوم کی نگاہوں میں گرانے کے مترادف ہے۔ یہ شکوک ایسے لوگ پھیلا رہے ہیں جو مسلم لیگ سے وابستہ رہے ہیں اور جنہیں قائد اعظمؒ کے رفقاء کی صف میں شامل ہونے کا دعویٰ بھی ہے۔ اوروں سے کیا گلہ !

اوروں سے کیا گلہ

ہمیں اوروں سے گلہ کیا جب کہ ہمارے اپنوں نے جن کے ہاتھوں میں زمام اقتدار رہی ہے' "دو قومی نظریہ" سے انحراف برتا ہے۔ پاکستان میں اس وقت تک تین آئین بن چکے ہیں۔ ان میں سے کسی آئین میں بھی' پاکستان میں بسنے والے غیر مسلموں کو الگ قوم قرار نہیں دیا گیا۔ ان حضرات کو کہتے سنا گیا ہے کہ اس زمانے میں کسی مملکت میں اس قسم کی پوزیشن تو بڑی انوکھی بات ہے۔ ان کی خدمت میں گزارش ہے کہ اس دور میں سب سے انوکھی بات تو مذہب (دین) کی بنیادوں پر مملکت کا قیام ہے۔ جب آپ نے اس "انوکھے مطالبہ" پر مملکت حاصل کر لی تو پھر اس کی تضمنات کے انوکھے پن سے کیوں گھبراتے ہیں؟

لیکن اپنے ہوں یا بیگانے (مخالفین) جو بھی "دو قومی نظریہ" کی مخالفت کرے گا وہ کسی صورت میں پاکستان کا بہی خواہ قرار نہیں پا سکتا۔ اس مملکت کی وجہ جواز "دو قومی نظریہ" اور قرآنی نظام کا قیام ہے۔ ان میں سے کسی ایک سے بھی انکار یا انحراف' مملکت کے خلاف بغاوت کے مرادف ہے۔

طلوع اسلام کنونشن - 94ء

مرتبہ محمد لطیف چوہدری

سحر کے اجالوں کا پیغام ہیں یہ
اندھیروں سے کیوں میر گھبرا رہے ہو

ملک میں فکری خلفشار اور ذہنی آوارگی کے نتیجہ میں' جو تباہی اور بربادی ہو رہی ہے' اس سے ہر قلب حساس نہ صرف پریشان ہے' بلکہ اس اضطراب و پریشانی کا کوئی مداوا بھی چاہتا ہے۔ اجتماعی طور پر یہ آواز ہمارے دل کی آواز ہے کہ ہماری سوختہ بختی کی وجہ بتائی جائے اور پھر اس سے بچ نکلنے کا صحیح راستہ بھی۔ اس پس منظر میں' طلوع اسلام کی تحریک وہ بنیادی اینٹ ہے جو سطح بیں نگاہوں کی توجہ کا مرکز تو نہیں لیکن ارباب فکر و نظر کے نزدیک اس کی اہمیت ایسی ہے کہ اگر اس بنیادی اینٹ پر عمارت کو استوار نہ کیا گیا تو مستقبل اس سے بھی زیادہ تاریک ہوتا چلا جائیگا اور ملت اسلامیہ راکھ کا ڈھیر بن کر رہ جائیگی۔ طلوع اسلام کے سالانہ کنونشن ملت کو راکھ کا ڈھیر بننے سے بچانے ہی کی تدابیر کی ایک کڑی ہے' جس میں' فضا کی ہنگامہ خیزیوں سے بے نیاز اور سیاسی مفادات کی جاذ بیتوں سے کنارہ کش' پیکرانِ مہرو وفا' دور دراز کا سفر کر کے' ہر سال کنونشن میں اس مقصد کو دل میں لے کر جمع ہوتے ہیں کہ یہ خطۂ پاک' قرآن کے نظام ربوبیت کی آماجگاہ بن جائے اور اس طرح زمین اپنے نشوونما دینے والے کے نور سے جگمگا اٹھے۔ کنونشن کے اجلاس جیسا کہ لوگ دیکھتے چلے آرہے ہیں۔ نہایت متانت اور سنجیدگی لئے' بغیر کسی غوغہ آرائی اور جذباتی نعرہ بازی کے منعقد ہوتے ہیں۔

امسال مندوبین کا قیام تو ادارہ کے نشیمن 25- بی گلبرگ II' ہی میں رہا لیکن اجتماعات شہر کے وسط میں واقع جناح ہال میں منعقد ہوئے۔

ان حسین و دلکش اجتماعات کے انتظامات میں لاہور اور لاہور چھاؤنی کی بزموں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کسی نے ہال کی تزئین و آرائش کی ذمہ داری قبول کر رکھی تھی' کوئی مطبخ سنبھالے ہوئے تھا اور کوئی مندوبین کے لئے رہائشی انتظامات کے لئے مصروف تگ و تاز تھا۔

مندوبین کے استقبال کا خوشگوار فریضہ بزم چنیوٹ کے خوش قامت نمائندہ محترم آفتاب عروج اور بزم پنج کسی کے روح

اوپر : (بائیں سے دائیں) چیئرمین ادارہ برگیڈیئر ریٹائرڈ اعزاز الدین احمد خان: کنونشن کے کھلے اجلاس سے خطاب کر رہے ہیں۔
برگیڈئر ریٹائرڈ منظور احمد صاحب: اپنا مقالہ پڑھ رہے ہیں۔ جناب علی محمد چدھڑ صاحب: اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے

درمیان : (بائیں سے دائیں) جناب خالد منصور نسیم تلاوت قرآن حکیم کرتے ہوئے۔ جناب عمر دراز صاحب: کنونشن کے پہلے اور
تیسرے اجلاس کے کمپیئر جناب آفتاب عروج صاحب: پہلے سیشن میں اپنا مقالہ پیش کر رہے ہیں۔

نیچے : (بائیں سے دائیں) محترمہ عارفی سلطانہ مقالہ پیش کر رہی ہیں۔ جناب عاطف طفیل: دوسرے سیشن کے کمپیئر اور جناب حسین
امیر فرہاد صاحب اپنا مقالہ پیش کر رہے ہیں۔

رواں جناب محمد حسین آزاد (جنہیں بار بار یہ وضاحت کرنا پڑتی کہ وہ آزاد تو ہیں لیکن مولانا آزاد نہیں) نے سنبھال رکھا تھا۔ جناب عروج صاحب رات گئے تک اس فکر میں غلطاں نظر آئے کہ مباداکوئی مسلمان ان سے بغلگیر ہوئے بغیر کیمپ میں نہ پہنچ گیا ہو۔

پہلا قافلہ قرآنی جو کیمپ میں داخل ہوا وہ احباب چنیوٹ پر مشتمل تھا۔ یہ 3 نومبر کی صبح تھی۔ شام تک مندوبین کے متعدد اور گروہ بھی مسرت بار قہقہوں کے جلو میں خیمہ گاہ میں تشریف لے آئے۔

مہمانوں میں اس دفعہ خواتین کی بھی خاصی بڑی تعداد شامل تھی۔ رہائش کے لئے معمول سے ہٹ کر عمارت سے متصل سڑک پر بھی محمدیؐ بستر بچھائے گئے تھے۔ جو لوگ تحریک طلوع اسلام کے متعلق عجیب و غریب غلط فہمیاں پیدا کرتے رہتے ہیں' اے کاش! وہ ایک نظر ان درویشان خدا مست کو دیکھتے جو خاک آلود پیشانیوں کے ساتھ اس جذب وانہماک سے فرش خاک پر محو استراحت تھے۔

کنونشن کے مصارف میں اکثر بزموں کی حسب اعطاء مالی معاونت کے علاوہ' بزم کراچی نے اول انعام پانے والے طلباء وطالبات کے لئے خوبصورت شیلڈیں فراہم کیں جبکہ مسلم کمرشل بنک اور ڈنمارک سے جناب ظفر اے خاں نے اول آنے والے یونیورسٹی لیول کے طلباء و طالبات کے لئے پانچ پانچ ہزار روپے کے نقد انعامات کا اعلان کیا۔ جناب عبیدالرحمان ارائیں نے اول آنے والی کالج لیول کی طالبہ کو ایک ہزار روپے کا انعام دیا اور سکاٹ لینڈ سے جناب عبدالعزیز صاحب نے آخری سیشن میں حصہ لینے والے سبھی طلباء وطالبات کو پانچ پانچ سو روپے کی کتب فراہم کیں۔

ادارہ ان تمام حضرات کے ایثار کے لئے ممنون ہے۔ کنونشن کی کاروائی ویڈیو پر ریکارڈ کی گئی۔ ویڈیو کیسٹس طلوع اسلام ٹرسٹ سے دستیاب ہیں۔

پہلا کھلا اجلاس

آج 4 نومبر ہے۔ ہلکی ہلکی سردی ہے۔ صبح کا وقت ہے۔ ناشتے سے فارغ ہو کر احباب جناح ہال پہنچنے کے لئے بسوں میں سوار ہو رہے ہیں۔ چہروں پر بشاشت اور مسکراہٹوں کا بہتا ہوا دریا ہے۔ جناح ہال کو' جو سیاسی' سماجی اور ادبی سرگرمیوں کا مرکز ہے' قرآنی آیات اور احادیث نبویؐ سے سجایا گیا ہے۔ لیجئے۔ مائیک پر پہلی نشست کے کمپیئر محترم محمد عمر دراز صاحب کی آوا بلند ہوئی۔ صدارت کے لئے پاکستان ٹیلی ویژن کے بین الاقوامی شہرت کے حامل کمپیئر اور قرآن کے شیدائی جناب طارق عز صاحب کا نام پکارا گیا۔ تلاوت قرآن اور کلام اقبال پیش عزیز کرنے کی سعادت جواں سال اور جواں ہمت نوجوان خالد منصور کے حصہ میں آئی۔ چیئرمین ادارہ جناب بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) اعزاز الدین احمد خاں صاحب نے خطبہ استقبالیہ پیش کر ہوئے حاضرین مجلس کو بالعموم اور کارکنان تحریک کو بالخصوص اس فریضے کی یاد دہانی کرائی جو بحیثیت مسلمان ان پر عائد ہوتا ہے

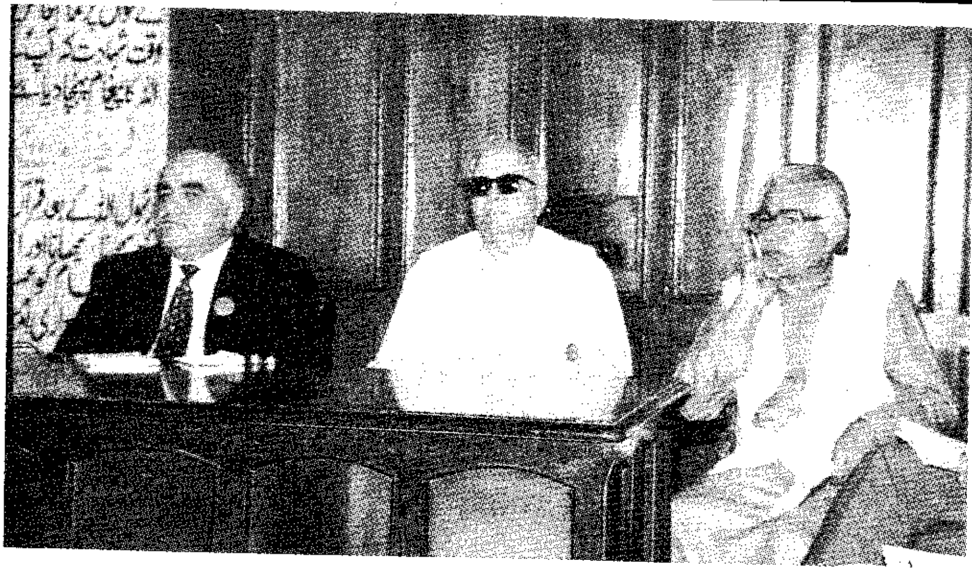

اوپر : چیئرمین ادارہ برگیڈیئر ریٹائرڈ اعزاز الدین احمد خان صاحب کھلے اجلاس کی صدارت کر رہے ہیں۔ ان کے دائیں جناب عبداللہ ثانی (وائس چیئرمین ادارہ) اور بائیں جناب عبیدالرحمان ارائیں صاحب (وائس چیئرمین ادارہ) تشریف فرما ہیں۔

نیچے : حاضرین مجلس کا ایک منظر

سورۃ مائدہ کی آیت 67 کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ ضابطہ خداوندی کو تمام انسانوں تک پہنچانے کا حکم اللہ تعالیٰ نے اگرچہ اپنے رسولؐ کو دیا تھا لیکن رسولؐ اللہ کی وفات کے بعد قرآن کو سمجھنے' سمجھانے اور اس کے عطا کردہ نظام کو عملاً نافذ کرنے کی ذمہ داری امت مسلمہ پر ہے۔ اپنے لائحہ عمل کی وضاحت کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ موجودہ کنونشن اسی پروگرام کی ایک کڑی ہے جس میں نژاد نو کو خاص طور پر شامل کیا گیا ہے۔ جو تین الگ الگ نشستوں میں پہلے سے دیئے گئے موضوعات پر اظہار خیال کے لئے سامنے آئیں گے۔

قوم اس وقت جس خلفشار سے دوچار ہے اس کے پیش نظر ان نوجوانوں کے لئے جن موضوعات کا انتخاب کیا گیا وہ یہ تھے۔

بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے۔ (یونیورسٹی لیول)

خودی تیری مسلمان کیوں نہیں ہے؟ (کالج لیول)

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی (سکول لیول)

اس کے لئے ملک کی تمام یونیورسٹیوں اور ان کے متعلقہ شعبہ جات' ملک بھر کے ڈگری کالجوں' لاہور اور گرد ونواح کے سبھی کالجوں اور سکولوں کو خطوط لکھے گئے جن کے جواب میں سینکڑوں مقالے موصول ہوئے جن میں سے منتخب طلباء وطالبات کو دعوت خطاب دی گئی۔

جناب چیئرمین صاحب کے خطاب کے بعد باری تھی یونیورسٹی لیول کے ان طلباء وطالبات کی جن سے مقالے کا عنوان تھا۔ "بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے" یوں تو ہم ملت پاکستانیہ کو یاد دلاتے رہتے ہیں کہ تحریک پاکستان کا مقصد و مسلک کیا تھا! اس میں کش مکش کیا تھی اور کس کس کے درمیان تھی! یہ یاد دہانی اس لئے بھی ضروری ہے کہ مطالبہ پاکستان کے سلسلہ میں یہاں بھانت بھانت کی بولیاں بولی جا رہی ہیں جن سے مقصود یہ ہے کہ اس مطالبہ کا حقیقی مفہوم ہماری نئی نسل کی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے یہی وجہ تھی کہ ہم نے ملت پاکستانیہ کے حصار کی بنا کی نشاندہی کا کام نوجوان نسل کے سپرد کیا اور یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ روح اقبال اور مطالبہ پاکستان کو کسی نے اگر حقیقی معنوں میں سمجھا ہے تو یہ یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم ہماری نوجوان نسل کے وہ نمائندے ہیں جنہوں نے ادارہ طلوع اسلام کے پلیٹ فارم سے کل پاکستان مقابلہ مقالہ نگاری میں حصہ لیا۔ آج کی مجلس مذاکرہ میں کل 10 طلبا وطالبات نے حصہ لیا جن میں سے

عزیزہ شان زہرہ نے اول' عزیزی عامر ملک نے دوم اور عزیزہ گوہر جمال نے سوم انعام حاصل کیا۔

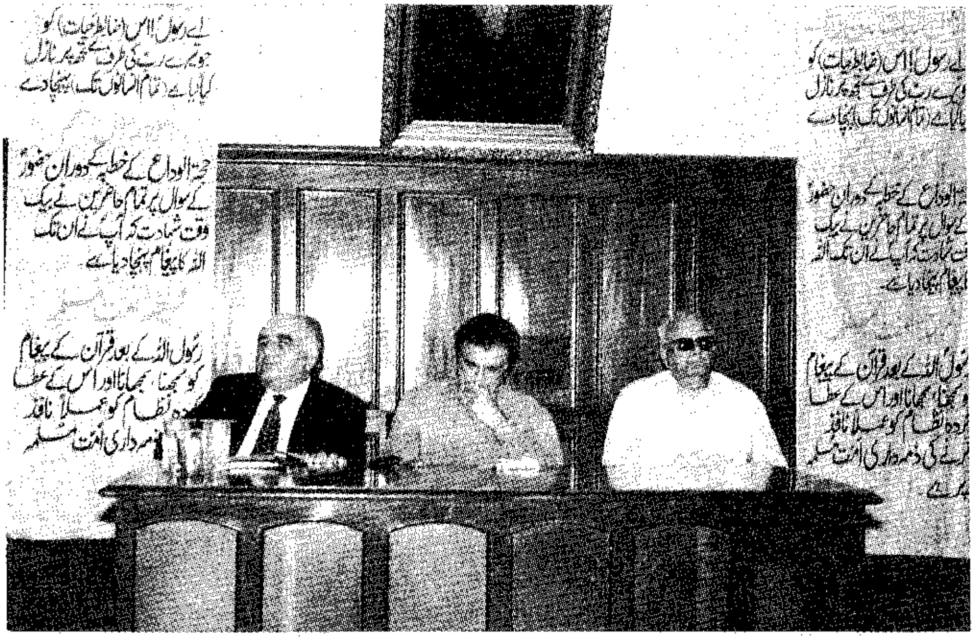

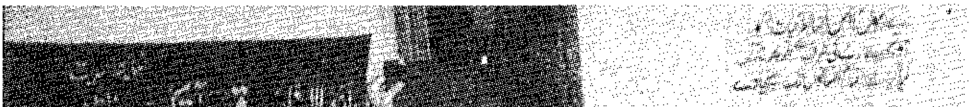

اوپر: کنونشن کے پہلے سیشن کے صدر: جناب طارق عزیز صاحب

نیچے: چیئرمین ادارہ جناب طارق عزیز صاحب کو بزم کراچی کی عطا کردہ شیلڈ پیش کر رہے ہیں۔

منصفین کے فرائض- جناب ایاز حسین انصاری' جناب محمد عمر دراز اور جناب عبیدالرحمان ارائیں نے ادا کیے- ڈاکٹر صلاح الدین اکبر بوجہ علالت تشریف نہ لا سکے-

تقسیم انعامات سے پہلے جناب طارق عزیز صاحب نے اپنے صدارتی خطاب میں طلباء کے حسن نگارش اور فن تقریر کا محاسبہ کیا اور پھر اپنی پرجوش اور ولولہ انگیز فکر سے سامعین کی رگوں میں خون تازہ کی گردش تیز کی- میں ان کی تقریر نقل کر دوں تو بھی اس جوش و جذبے کا اظہار نہ کرپاؤں گا جو ان کے فن تقریر کا طرۂ امتیاز ہے- ان کی تقریر کا ویڈیو ٹیپ طلوع اسلام ٹرسٹ سے دستیاب ہے-

دوسرا کھلا اجلاس

پروگرام کے مطابق کنونشن کی دوسری نشست 3 بجے شروع ہوئی یہ نشست بھی نژاد نو ہی کے لئے مختص تھی- ایک سو اضافی نشستیں فراہم کرنے کے باوجود ہال تنگی داماں کی تصویر بنا ہوا تھا- خواتین کی تعداد معمول سے کہیں زیادہ تھی صدارت کے لئے کاروان قرآنی کے دیرینہ ہمسفر جن کی کاوشوں سے ؎

دشت تو دشت ہیں' دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے!
بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے!

کے مصداق کویت میں قافلہ قرآنی تیز سے تیز تر ہو رہا ہے' کا نام پکارا گیا- یہ تھے جناب عبیدالرحمان ارائیں جو کنونشن میں شمولیت کے لئے کویت سے براہ راست تشریف لائے تھے' سٹیج سیکرٹری کا فریضہ جواں سال ساتھی محترم عاطف طفیل کے حصہ میں آیا' کلام اقبال سے گرمی محفل کا سامان تحریک کے مغنی چوہدری فضل داد نے مہیا کیا- اور مسئلہ زیر بحث پر گفتگو کا آغاز ہوا-

حقیقت یہ ہے کہ جو ارباب دانش' اصلاح معاشرہ کے لئے اپنے ذہن سے تدابیر سوچتے ہیں وہ مختلف نتائج پر پہنچتے ہیں- کوئی کہتا ہے ملک میں رائج قوانین میں بنیادی خرابی ہے- کوئی کہتا ہے یہاں کا سیاسی نظام غلط بنیادوں پر استوار ہے- ایک طرف سے آواز آتی ہے اصل خرابی معاشی نظام کی ہے- یہ اور اس قسم کی آوازیں مختلف سمتوں سے آتی ہیں لیکن قرآن کہتا ہے یاد رکھو! کسی قوم کے خارجی حالات میں اس وقت تک تبدیلی نہیں ہو سکتی- جب تک اس کے قلب و دماغ میں تبدیلی نہ ہو- جب تک اس کی ذہنیت نہ بدلے- جب تک اس میں فکری اور ذہنی تبدیلی نہ ہو- جب تک اس میں نفسیاتی تبدیلی نہ ہو- یا یہ کہ جب تک اس کی خودی مسلمان نہ ہو- یہ خدا کا اٹل قانون ہے جس کے خلاف کبھی نہیں ہو سکتا-

"خودی تیری مسلماں کیوں نہیں ہے" کے عنوان سے کم و بیش 15 طلباء و طالبات نے اپنی اپنی بصیرت کے مطابق روشنی

اوپر : حاضرین مجلس کا ایک منظر

نیچے : ڈان ماڈل سکول کے بچے ملی ترانہ پیش کر رہے ہیں۔

ڈالی۔ مقابلے کا اول انعام لاہور کالج برائے خواتین کی طالبہ عزیزہ بٹی عاصمہ فردوس نقوی کے حصہ میں آیا جبکہ دوسرا اور تیسرا انعام عائشہ انصاری اور عزیزی شہباز گل نے حاصل کیا۔

منصفین کے فرائض۔ جناب ایاز حسین انصاری۔ جناب عبداللہ ثانی اور جناب محمد حسین آزاد نے ادا کئے۔

آخر میں صدر محفل جناب عبدالرحمان ارائیں نے طلبا کی آرا کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے وضاحت کی کہ جب تک ہم اپنی موجودہ روش کو تبدیل کر کے' قرآن کے تجویز کردہ اصول کی طرف نہیں آتے۔ ہمارے حالات میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں ہو سکتی۔ پاکستان میں یہ سعادت صرف طلوع اسلام کے حصہ میں آئی ہے کہ وہ اس دعوت کو سلسلہ وار متواتر پیش کرتا چلا آرہا ہے۔

تیسرا کھلا اجلاس

مملکت پاکستان اس لئے وجود میں لائی گئی تھی کہ یہ اسلام کی تجربہ گاہ بن سکے۔ تجربہ گاہ بننے سے مراد یہ تھی کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظام' زمانہ قدیم میں تو قابل عمل تھا لیکن اب ایک نئی دنیا وجود میں آچکی ہے۔ زمانے کے انداز بدل چکے ہیں۔ انسانی تمدن اور عمرانیت کے طور طریق اور سے اور ہو چکے ہیں۔ ان حالات میں اب عہد کہن کا کوئی نظام کامیاب نہیں ہو سکتا۔

مقصد یہ تھا کہ ان لوگوں کو عملاً بتا دیا جائے کہ اسلامی نظام کا مدار حقائق ابدی پر ہے جو نہ کبھی پرانے ہوئے ہیں نہ فرسودہ۔

اس نظام میں آج بھی یہ صلاحیت موجود ہے کہ یہ نوع انسانی کی مشکلات کا حل پیش کر سکے اور وہی انسانیت ساز نتائج پیدا کر سکے جو اس نے آج سے چودہ سو سال پہلے پیدا کئے تھے۔ مملکت پاکستان اس امر کی زندہ شہادت پیش کرنے کے لئے وجود میں لائی گئی تھی۔ لیکن افسوس کہ اس طرف توجہ نہ دی گئی اور ہمارے اس طرز عمل سے دنیا کے دل میں بالعموم اور اس مملکت کی نئی نسل کے دل میں ابھرنے والا خیال بالخصوص پختگی اختیار کرتا چلا گیا کہ اب اس میں یہ صلاحیت نہیں رہی کہ یہ نوع انسانی کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکے۔ اس خیال کے عام ہونے سے جو تباہ کن نتائج پیدا ہو سکتے ہیں ان کے متعلق اس سے زیادہ کچھ کہنے کی ضرورت نہیں کہ "خدا عدو کو بھی یہ خواب نہ دکھلائے۔" اس خدشہ کے پیش نظر ضروری سمجھا گیا کہ موضوع کو بار بار نژاد نو کے سامنے لایا جائے۔ آج کنونشن کا دوسرا دن ہے۔ صبح کے ساڑھے نو بجے ہیں۔ جناح ہال متلاشیان حق سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔ سٹیج سیکرٹری کا شعبہ آج بھی محترم محمد عمر دراز صاحب کے سپرد ہے۔ صدارت کے لئے عمر رسید مگر جواں ہمت شخصیت ادارہ طلوع اسلام کے چیئرمین بریگیڈیئر (ریٹائرڈ) محترم اعزاز الدین احمد خاں صاحب کو دعوت

حاضرین مجلس کا ایک اور منظر

دی گئی ہے۔ تلاوت قرآن کا حق لاہور بزم کے رکن خالد نسیم منصور نے ادا کیا اور کلام اقبال چوہدری فضل داد نے پیش کیا۔

جن حضرات نے مقالے پیش کئے ان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔

1- محترم محمد سلیم قمر صاحب
2- برگیڈیئر محترم ڈاکٹر منظور احمد صاحب
3- محترم علی محمد چدھڑ صاحب
4- محترم آفتاب عروج صاحب
5- محترمہ عارفی سلطانہ صاحبہ

آخر میں صدر مجلس جناب اعزاز الدین احمد خانصاحب نے صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے بتایا کہ ہم نے اسلام کو بطور نظام کے اپنایا ہی کب ہے جو اس کی کامیابی و ناکامی کا تجزیہ کریں۔ دین اور مذہب کے فرق کو واضح کرتے ہوئے انہوں نے کہا کہ ایک "مذہب" ہے جسے دوسرے اہل مذاہب کی طرح ہم نے بھی سینے سے لگا رکھا ہے۔ نام رکھ لیا ہے اس کا اسلام۔ اور توقعات قائم کئے ہوئے ہیں ان ثمرات کی جو دنیا کا کوئی مذہب بھی فراہم نہیں کر پایا۔ ان کا مقالہ طلوع اسلام کے نومبر کے شمارے میں چھپ چکا ہے۔

چیئرمین صاحب کے خطاب کے ساتھ ہی یہ نشست اختتام پذیر ہوئی۔

چوتھا کھلا اجلاس

کھانے کے وقفے کے بعد راہروان شوق ایک بار پھر جناح ہال کا رخ کر رہے ہیں۔ اب باری ہے سکول کی سطح کے طلباء و طالبات کی، جن کی خاصی بڑی تعداد ہال میں موجود ہے لیکن دعوت خطاب صرف 15 طلبا کو دی گئی ہے۔

کل پاکستان مقابلہ مقالہ نگاری کے اس مقابلے کی صدارت کر رہے ہیں جناب عبداللہ ثانی صاحب جو پشاور سے تشریف لائے ہیں و منصفین کے فرائض جناب اشرف ظفر، جناب علی محمد چدھڑ اور جناب حسین قیصرانی ادا کر رہے ہیں۔

سٹیج سیکرٹری کے لئے دعوت دینے سے پہلے ناظم ادارہ نے گلشن قرآنی کی عندلیب اور محفل قرآنی کی طاہرہ بہن ثریا عندلیب مرحومہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ہال میں موجود نابغہ، روزگار خاتون کی بیٹی صالح نغمی کو دعوت دی جنہوں نے اسی ایک محفل میں اپنی تعلیمی استعداد اور اپنی والدہ کی تربیت کا حق ادا کر دیا۔ مذاکرے کا عنوان تھا۔ "عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی"۔

اوپر' نیچے: جناح ہال' لاہور حاضرین سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔

مذاکرے میں 10 طلباء وطالبات نے حصہ لیا اور عزیزہ عمارہ مہرین نے اول' عزیزہ صائمہ حمید نے دوم اور عزیزہ تابندہ قمر نے سوم انعام حاصل کیا۔

اپنی صدارتی تقریر میں جناب عبداللہ ثانی صاحب نے بچیوں کو زبردست خراج تحسین پیش کیا اور اپنے مخصوص طرز خطابت سے محفل کو کشت زعفران بنائے رکھا۔

یہ کنونشن کی آخری نشست تھی۔ اس نشست کے اختتام پر کچھ احباب نے واپسی اختیار کی اور کچھ اگلے روز ہونے والے ادارہ کی جنرل کونسل کے اجلاس کے لئے ٹھہر گئے۔

آخر میں مشعل برداران قرآن کی اس عظیم برادری کے لئے دعا ہے کہ اللہ کریم آپ کے عمروں میں درازی' آپ کے عزائم میں پختگی۔ آپ کے قدموں میں ثبات اور آپ کے مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے۔ آپ ہر سال اس درخشندہ و پابندہ مقصد کی کرنیں بکھیرتے' اسی طرح یہاں آتے رہیں اور تاعمر قرآن خالص کی ضیا بار روشنی سے دنیا و جہان کی راہیں روشن کرتے رہیں۔

قرار دادیں

ایبٹ آباد سے آئے ہوئے جناب غلام مصطفیٰ اعوان ایڈووکیٹ نے درج ذیل قرارداد پیش کی جسے ایوان نے متفقہ طور پر منظور کر لیا۔

> یہ کنونشن کارپوریشن لاہور کا شکریہ ادا کرتی ہے کہ انہوں نے جناح ہال میں ادارہ کی کنونشن منعقد کرنے کی سہولت فراہم کی مگر اس امر پر افسوس کا اظہار کرتی ہے کہ جناح ہال جو ملت کے عظیم قائد کے نام پر قائم کیا گیا ہے اسے قائد کے شایان شان نہیں بنایا گیا۔ یہ کنونشن حکومت پنجاب سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ جناح ہال کی تزئین و آرائش پر بھرپور توجہ دے۔

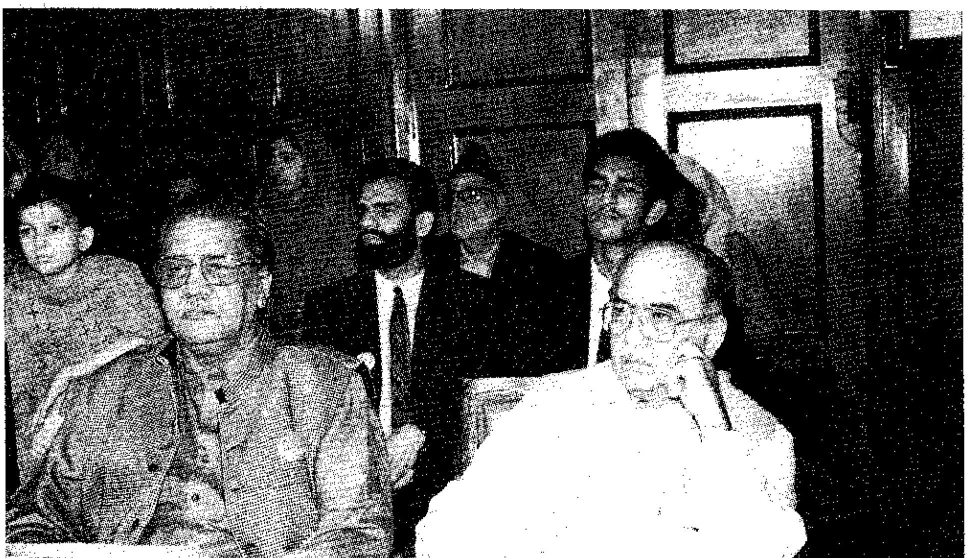

اوپر : حاضرین مجلس کا جذب و انہماک

نیچے : بائیں سے دائیں جناب عطاالرحمٰن ارائیں صاحب پبلشر اور جناب محمد لطیف چوہدری ایڈیٹر ماہنامہ طلوع اسلام اور ناظم ادارہ، ہمہ تن گوش ہیں۔

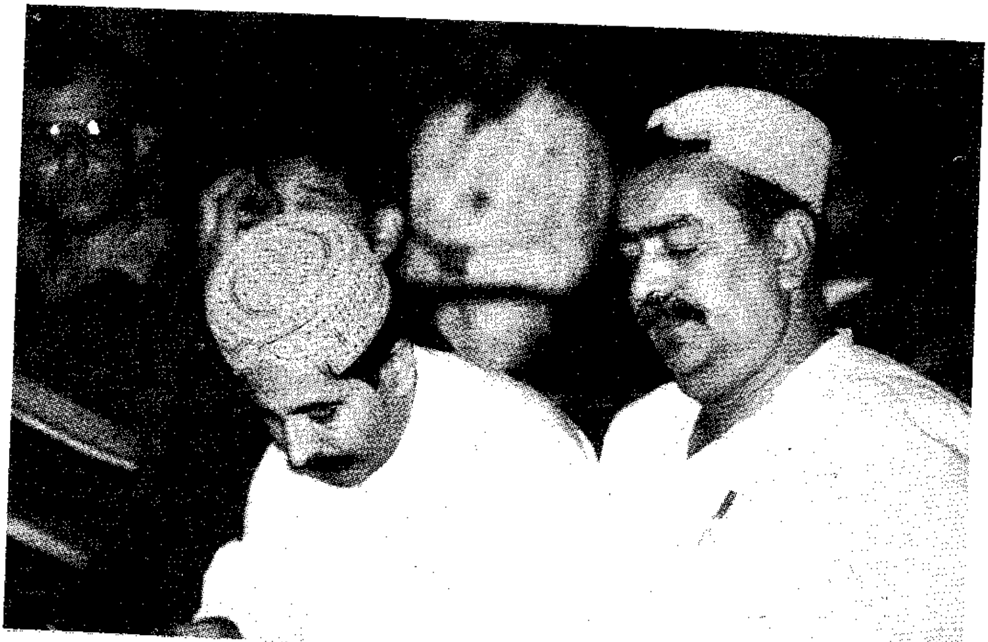

اوپر : لاڑکانہ اور میرپور خاص (سندھ) کے مندوبین
نیچے : اختتامی سیشن کی کمپیئر مس صالح نغمی اور صدر اجلاس جناب عبداللہ ثانی صاحب

حقائق و عبر

علامہ غلام احمد پرویزؒ معاصرین کی نظر میں

جناب عبدالعزیز صاحب، قلمی معاون (ویک اینڈ) مقیم لندن، ممتاز ترقی پسند دانشور، شاعر ڈاکٹر خیال امروہوی سے اپنے ایک تحریری مکالمے کے حوالے سے ماہنامہ شام و سحر کے نومبر 94ء کے شمارہ میں رقمطراز ہیں۔

سوال : آپ نے اپنی کتاب "نئی سوچ" (جو مختلف مضامین کا مجموعہ ہے) میں ایک جگہ جناب غلام احمد پرویز کو دور حاضر کا مستند ترین مفسر قرآن اور نادر محقق تصور کیا ہے اور ان کے بارے میں یہاں تک لکھا ہے کہ انسان کو نجات دلانے میں سرسید احمد خاں کے بعد اگر کسی شخصیت کی ضرورت تھی تو وہ جناب غلام احمد پرویز تھے۔ میرا خیال ہے کہ آپ نے شاعر ہونے کے ناطے مرحوم کے بارے میں مبالغہ بلکہ غلو سے کام لیا ہے، ذرا اس بات کی توضیح کر دیجئے ٥

جواب : قرآن کریم لسان العربی میں نازل ہوا۔ عجمی یعنی غیر عرب زبان کا صحیفہ نہیں ہے۔ لہٰذا اس کی تفسیر و تشریح بھی عجمی نہیں کی جا سکتی۔ جس طرح دنیا کی عام زبانیں پہلے درجے پر مادری اور دوسرے درجے پر عوامی یا ادنیٰ مفاہیم رکھتی ہیں، اسی طرح عربی بھی علاقائی مفہوم کی حامل ہے۔ قرآنی الفاظ کا جو مفہوم عرب سمجھ سکتے ہیں، غیر عرب وہ معنی اور مفہوم نہیں سمجھ سکتے۔

سرسید احمد خاں کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اسلام کو نیچرل، دین فطرت کے نقطۂ نظر سے پرکھا۔ جب کہ غلام احمد پرویز نے اس مکتبۂ فکر کو آگے بڑھاتے ہوئے قرآن کو لغت العربی کے استناد کی بنیاد پر سمجھانے کی کوشش کی۔ چنانچہ پرویز نے اپنی اس سعیٔ جمیلہ کے دوران لغات القرآن مرتب کر ڈالی۔ اس کوشش کا علمی نتیجہ یہ ہوا کہ بہ اعتبار حروف تہجی ہمارے سامنے قرآنی الفاظ کے وہ معنی آگئے جو عربی لغت کے لحاظ سے مستند ہیں۔ ان الفاظ کی تشریح و تفسیر پر تو قدرے مختلف رویہ اختیار کیا جا سکتا ہے، لیکن عربی الفاظ کی لغت کے اعتبار سے جھگڑا فساد نہیں کیا جا سکتا۔ لغات القرآن کی مزید خصوصیت یہ ہے کہ پرویز نے عربی الفاظ کا مادہ مخرج شناخت کرنے کے لئے جامع اصول بنا دیئے ہیں، جن کے حوالے سے ہر لفظ کا بنیادی مادہ سمجھنے میں آسانی ہو گئی ہے۔ قرآن عظیم کے دو انداز بیان ہیں : i- براہ راست احکام۔ ii- بذریعہ متشابہات تہدید احکام۔

اول الذکر انداز دانشوروں کے لئے ہے جب کہ موخرالذکر کم فہم عوام کے لئے یا پھر انسانوں کے لئے۔ اب تک قرآن کی جس قدر تفسیریں بھی کی گئیں ہیں، ان میں روایت کا دخل رہا ہے۔ درایت (عقل) کو کم ہی کام میں لایا گیا۔ جب کہ قرآن

نے فکر و تدبر کے لئے بار بار ہدایات کیں' لیکن عام مفسرین نے عقلی تفسیر پر کبھی زور نہیں دیا بلکہ مسلمانوں کو عقل و وجدان کے برزخ میں معلق رکھنے کی کوشش کی- سرسید احمد خاں کی تفسیر احمدیہ (جو غالباً نایاب ہے) ایسی ایسی نادر تحقیق سے معمور ہے' جس کی نظیر نہ ابوالکلام کے یہاں ہے' نہ علامہ مشرقی اور نہ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے یہاں- یہ لوگ سورۂ فاتحہ ہی سے انسانی فکر کی بنیاد مابعدالطبعی اصطلاحات پر رکھنے کے عادی رہے ہیں- ان کی تقصیر بھی نہیں' کیوں کہ ان حضرات کے ادوار میں نہ سائنس تھی' نہ جدید فلسفہ' نہ عقلیت پسندی' لیکن آج اگر ہم چاہیں کہ نئی نسل کو (جو سائنسی علوم سے آراستہ ہے) قرآنی اسرار و رموز اور اس کی ہمہ گیر دانش سے روشناس کرائیں تو قرآنی معارف کی جدید علوم کی روشنی میں تشریح کرنی ہو گی- اس موضوع پر قرآن نہ صرف عصر حاضر بلکہ آئندہ صدی کے جدید ترین تقاضوں کا ساتھ دے سکتا ہے' لیکن اس کے جدید شارحین "کٹھ ملا" نہیں ہو سکتے- یہ فرائض ماڈرن علوم کے سکالرز ہی کر سکتے ہیں- لہٰذا غلام احمد پرویز' سرسید احمد خاں اور آنے والے روشن خیال شارحین قرآن کی درمیانی کڑی کی حیثیت رکھتے ہیں' جنھوں نے عملی طور پر بہ ہزار دقت و تحقیق قرآن کو عربی لغات اور علم بیان و معانی' صرف و نحو کی روشنی میں سمجھنے کیلئے علمی خطوط (OUT - LINE) سے روشناس کرا دیا-

میرے خیال میں جسے قرآنی معارف سمجھنے کا شوق ہے' اسے پرویز کی تمام کتابیں پڑھ لینی چاہئیں- مطالعہ میں مضائقہ نہیں- برصغیر پاک و ہند کے عوام میں بڑا نقص یہ ہے کہ یہ لوگ صرف اپنے باپ' دادا اور ملا کی بات سننے اور آنکھوں پر پٹی باندھ کر تقلید کے عادی ہیں- یہ لوگ کسی استاد اور محقق کی کبھی نہیں سنتے' کیونکہ انہیں بتا دیا گیا ہے' علم حاصل کرنا' علمی تحقیق کرنا (بالخصوص قرآن کے سلسلے میں) سخت گناہ ہے' اور علم حاصل کرنے والے کو دوزخ کا ایندھن بنا دیا جاتا ہے- یہ لوگ رسن جہنم سے خائف ہیں' جسے صدیوں سے حلوہ خور ملاؤں نے دنیا کے ہر حصے میں بھڑکا رکھا ہے- وگرنہ سرسید' پرویز' ڈاکٹر برق' اور اسی قسم کے سکالروں نے قرآن کو سائنسی انداز میں سمجھنے کی جو کوششیں کی ہیں اس کی مثال تو خود عراق و عرب میں بھی نہیں ملتی- بقول آپ کے میں نے شاعرانہ غلو نہیں کیا' نہ میں نیچری ہوں' نہ پرویزی- دنیا کے تمام سکالروں سے فیضیاب ہونے کی کوشش کرتا رہتا ہوں- پرویز کی کتاب "انسان نے کیا سوچا" یا "لغات القرآن" بھی میں نے پڑھی بلکہ روزانہ مطالعہ رہتا ہے- ایسی نادر تحقیقات پہلے نہ دیکھی نہ سنیں- سرسید کے "مقالات" نے ہندوستان میں دھوم مچا دی تھی یہ اور بات کہ جہلا ہر سکالر کا تختہ کر سکتے ہیں' آج بھی کر رہے ہیں' لیکن علم کی حقیقت کو تو برباد نہیں کر سکتے' وہ ہمیشہ قائم رہے گی-

نبی اکرمؐ شیعہ تھے نہ سنی

(علی محمد چدھڑ)

کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ وطن عزیز پاکستان میں جو کچھ ہو چکا ہے یا جو اس وقت ہو رہا ہے اگر علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ ایک دفعہ زندہ ہو کر دیکھ لیں تو اس دھچکے سے کسی صورت بھی جانبر نہ ہو سکیں۔ مثلاً جب انہیں پتہ چلے کہ مشرقی پاکستان نہرو کی بیٹی لے گئی ہے۔ دو قومی نظریہ چار یا پانچ قومی نظریہ میں بدل گیا ہے۔ قوانین خداوندی کے نفاذ کو اسلام کے اجارہ داروں نے عملاً" ناممکن بنا دیا ہے۔ تھیا کریسی کے لئے میدان صاف ہو چکا ہے۔ مسلم لیگ مرگئی ہے اور اس کے مزار پر کچھ مجاوروں نے اپنے الگ الگ حجرے سجا لئے ہیں۔ تو ان کے مزید زندہ رہنے کی کوئی صورت باقی نہ رہتی۔

کہتے ہیں کہ کسی عمارت کی اہمیت یا تعمیری مقاصد جاننے کے لئے اس کے آرکیٹکٹ اور انجینئر کے پاس ہی جانا پڑتا ہے۔ علامہ اقبالؒ نے دینی مملکت کا تصور پیش کیا اور قائداعظمؒ نے اس تصور کی عملی تشکیل کی۔ اس طرح ایک مملکت تو وجود میں آگئی۔ لیکن ان کی تمناؤں کے پیش نظر نفاذ اسلام کے ذریعہ اسے اسلامی مملکت بنانا ابھی باقی ہے محض نام بدل دینے سے کوئی مملکت اسلامی نہیں ہو جاتی۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ابھی تک اسلام کے متعلق ہمارا تصور ہی ناقص ہے اور کسی دینی مملکت کی کوئی واضح شکل (سوائے صدر اول کے) ہمارے سامنے نہیں۔ لہٰذا پہلے یہ دیکھنا ہے کہ اسلام اور اسلامی مملکت کے متعلق ان دونوں راہنماؤں کے کیا تصورات تھے۔ اس سلسلہ میں عرشی صاحب نے ایک مرتبہ علامہ اقبالؒ سے پوچھا کہ "خارج از قرآن ذخیرہ احادیث و روایات اور کتب فقہ وغیرہ کو شامل کر کے اسلام مکمل ہوتا ہے یا صرف قرآن اس باب میں کفایت کرتا ہے" انہوں نے فرمایا "یہ چیزیں تاریخ و معاملات پر مشتمل ہیں۔ ان کی بھی ضرورت ہے۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ کن ضروریات کے تحت وضع کی گئیں۔ لیکن نفس اسلام قرآن مجید میں بکمال و تمام آچکا ہے۔ خدا تعالیٰ کا منشا دریافت کرنے کے لئے ہمیں قرآن سے باہر جانے کی ضرورت نہیں" (اقبال اور قرآن ص 297) قرآن کی قانونی حیثیت کے متعلق فرمایا کہ "سب سے پہلے ہمیں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا چاہئے کہ قرن اول سے لیکر عباسیوں کے زمانے کے آغاز تک مسلمانوں میں قرآن کے سوا کوئی تحریری قانون موجود نہیں تھا" (اقبال اور قرآن ص 151)

علامہ صاحب کے بعد آیئے یہ معلوم کریں کہ قائداعظم پاکستان کو کیسی مملکت بنانا چاہتے تھے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ "پاکستان ایک مسلم سٹیٹ ہو گی" (تقاریر جلد دوم ص 326) اور ہمارا نصب العین تھیاکریسی نہیں۔ ہم تھیاکریٹک سٹیٹ نہیں بنانا چاہتے۔ (تقاریر جلد دوم ص 386)

اگست 1941ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلبا سے آپ کے کچھ سوال و جواب ہوئے۔ ایک سوال یہ تھا۔ اسلامی حکومت کے تصور کی امتیازی خصوصیت کیا ہے؟

جواب :- اسلامی حکومت کے تصور کا امتیاز ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے- جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی ہے-

اور قرآنی اصول و احکام کی حکمرانی کا مفہوم کیا ہے- اس کی وضاحت کتاب اللہ نے یوں کر دی کہ :-

(1) تم لوگوں میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو 5/48

(2) اگر کسی معاملہ میں تم میں اختلاف ہو جائے- تو اس کا فیصلہ خدا کی کتاب کے مطابق کر لیا کرو- 42/10)

(3) اور جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے نہیں کرتے- انہیں کو کافر کہا جاتا ہے- 5/44

ان آیات مقدسہ میں دیگر امور کے علاوہ ہماری راہنمائی کے لئے کفر اور اسلام میں ایک حد امتیاز بھی کھینچ دی گئی ہے- لہٰذا ہمارے لیئے لمحہ فکریہ یہ بھی ہے کہ سنتالیس سال کے اس ریکارڈ دور میں یہ دیکھا جائے کہ ہم قرآنی اسلام کے معیار پر کہاں تک پورے اترے ہیں- اور کتاب اللہ کی حکمرانی میں کیا پیش رفت ہوئی ہے- اپنے اعمال سے ہر کوئی واقف ہے- نتائج ہمارے سامنے ہیں- ہم سے کافی عرصہ بعد آزاد ہونے والی سیکولر نظریات کی حامل اقوام سیاسی اور معاشی لحاظ سے ہمیں بہت پیچھے چھوڑ گئی ہیں اور ہمارے راہنمایان ملت ابھی تک وعدۂ فردا یعنی جنت بعد از مرگ کی خوش خبریاں دے رہے ہیں- گویا مسلمان قوم کے مقدر میں اس دنیا میں سوائے غلامی اور محتاجی کے اور کچھ نہیں- اور ہمارا فرقان حمید (نعوذ وباللہ) صرف روز قیامت کے معاملات نمٹانے کے لئے نازل ہوا تھا-

تحریک پاکستان کی ساری تاریخ گواہ ہے کہ اس مملکت کی بنیاد نہ تو وطن ہے اور نہ ہی آمریت کے دور کا کوئی فقہی مذہب- ہمارے قائدین نے اللہ سے یہ پیمان کیا تھا کہ ایسی مملکت ملنے کی صورت میں یہاں قرآن پر مبنی خلفائے راشدین کے وقت کا دین نافذ کیا جائے گا- گو ہمارے کچھ مذہبی اور سیاسی عناصر ان حقائق کو مشکوک اور متزلزل کرتے رہے اور اب بھی اسی خبث باطن کا اظہار کرتے رہتے ہیں' لیکن وہ تاریخ کے اوراق سے یہ نقوش نہیں مٹا سکے کہ یہ ملک احیائے اسلام کیلئے ہی حاصل کیا گیا تھا- اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا ہم خدا کے حضور کسی وعدہ خلافی کے مرتکب تو نہیں ہوے- اگر ایسا ہی ہے تو پھر قانون مکافات عمل کی گرفت سے ہمیں کوئی نہیں بچا سکتا- قرآن نام لے لے کر بتاتا ہے کہ نافرمان اقوام کس طرح اپنے جرائم کی پاداش میں تباہ ہو گئیں- ہمارے مذہبی پیشواؤں کی خوش فہمی دیکھئے کہ وہ کہتے ہیں کہ اس تباہی کا تعلق دوسری اقوام سے ہے- ہمارے ساتھ نہیں لیکن واضح رہے کہ قرآن کریم میں یہ حقائق بیان تو اس طرح کئے جاتے ہیں جیسے یہ کسی اور مذہب کی داستان ہو- لیکن یہ کسی خاص قوم یا خاص مذہب سے مختص نہیں- یہ ایسے حقائق ہیں جن کا تعلق ہر مذہب اور مذہب پرست قوم سے ہے اور جو قوم بھی ان حقائق پر مبنی قوانین کی خلاف ورزی کریگی اسی تباہی کا شکار ہو گی-

موجودہ مسلم ورلڈ پر نظر ڈالئے- بوسنیا- صومالیہ- یمن- افغانستان- عراق- کشمیر اور فلسطین کے مسلمان جس قتل و غارت- بھوک اور ذلالت کا شکار ہیں- یقیناً یہ وہ عذاب ہے- جو قانون مکافات کے نتیجہ کے طور پر سامنے آیا ہے- یہ وہ جہنم

ہے جس کی آگ کا ایندھن ہمارے اعمال ہی بنے ہوئے ہیں- اپنے وطن عزیز پاکستان کی حالت کا جائزہ لیں تو کونسا عذاب ہے جو ہم پر مسلط نہیں- گنتی کے چند مترفین بارہ کروڑ عوام کی قسمت کے مالک بنے بیٹھے ہیں- خانقاہیں انسانی تذلیل کی آماجگاہوں میں بدل چکی ہیں- درندہ صفت انسان عوام کو لوٹ رہے ہیں- کروڑوں اربوں کے سکینڈل ہماری پہچان بنے ہوئے ہیں- مال وجان خود محافظوں کے ہاتھوں محفوظ نہیں- عصمتیں لوٹی جا رہی ہیں- مذہبی بربریت سینکڑوں جانوں کو نگل چکی ہے- دہشت گردی- بدمعاشی اور ڈاکے روز کا معمول ہیں- بس یوں سمجھئے کہ نفسا نفسی کا عالم ہے- اس پر بھی ہمارے اقتدار پرست راہنما اپنی کرسی کی دھن میں وطن عزیز کو ایک فلاحی اسلامی مملکت بنانے کے کھوکھلے دعوے کرتے رہتے ہیں-

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ "اے جماعت مومنین! ایسا کبھی نہ کرو کہ زبان سے بڑے بڑے دعوے کرتے رہو اور انہیں عملاً پورا کر کے نہ دکھاؤ- قانون خداوندی کی رو سے یہ بات بڑی مذموم اور قابل گرفت ہے کہ ایسی باتیں کی جائیں جنہیں کر کے نہ دکھایا جائے 61/2-3

قارئین محترم! یہ تھیں چند باتیں جو دین اور تاریخ کے حوالے سے عرض کر دی ہیں- اختلاف کا حق ہر کسی کو حاصل ہے- لیکن قرآن کریم تو کوئی اختلافی کتاب نہیں ہے- اس لئے ہمارا فرض بنتا ہے کہ اس اساس پر اپنے تمام اختلافات مٹا کر وحدت ملی کا عملی مظاہرہ کریں- ہماری منزل صدر اول کا مثالی دور ہے- جس کا مروجہ فقہی مذاہب سے کوئی تعلق نہیں- ہمیں ان فروعی اختلافات سے بالا تر ہو کر کام کرنا ہے- جو لوگ کسی فقہی مسلک یا فرقہ سے منسلک ہو کر اپنے آپ کو فخریہ حنفی- اہل حدیث یا شیعہ کہلاتے ہیں ان کا یہ عمل دین کی ہمہ گیر تعلیم کے مطابق نہیں- قرآن میں اللہ نے ہمارا نام مسلم تجویز کیا ہے- اور یہ بھی بتا دیا ہے کہ یہ کوئی نیا نام نہیں- اس قسم کی جماعتوں کا نام پہلے بھی مسلم ہی رکھا تھا (22/78) اسی طرح جب لوگوں کو یہودی یا عیسائی ہونے کی ترغیب دی گئی تو اللہ تعالیٰ نے حضورؐ سے کہلوایا کہ "ان سے کہو تم مسلک ابراہیمی کی طرف دعوت کیوں نہیں دیتے- ابراہیم نہ یہودی تھا نہ عیسائی (3/66) وہ خالص دین خداوندی کا متبع تھا اور اس میں کسی غیر خدائی تصور کو شریک نہیں کرتا تھا- 2/135

قرآن کی اس وضاحت کے بعد اسی قسم کا سوال مروجہ مسالک کے ان دعوے داروں سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ رسول اکرمؐ نہ شیعہ تھے نہ اہل حدیث لہٰذا آپ اپنی موجودہ روش کو چھوڑ کر صرف مسلم کیوں نہیں کہلاتے- میرا خیال ہے کہ قرآن کی اس بہت بڑی سند کے بعد انہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ کائنات کا نظام پوری یک جہتی کیساتھ ایک ہی منزل کی طرف رواں دواں ہے- اللہ تعالیٰ اس نظام کی مثال دیکر فرماتے ہیں کہ "تم ہو کہ تمہارے خیالات بھی الگ الگ ہیں اور منزلیں بھی جدا جدا 51/8" گویا خالص دین خداوندی کی ایک ہی راہ (صراط مستقیم) ہے اور اسے ہمارے مختلف طور طریقے قطعاً" پسند نہیں ہیں-

اب جو حضرات اپنے الگ الگ 'مسالک' (پرسنل لاز) پر اصرار کرتے ہیں اور اسی کے مطابق نفاذ شریعت کی آس لگائے بیٹھے ہیں۔ وہ پاکستان میں ایرانی عراقی یا سعودی طرز کا اسلام تو لا سکتے ہیں۔ لیکن صدر اول کے دین کا تصور کبھی نہیں کر سکتے۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا' تو یہ ہمارا قومی سانحہ اور ملی گناہ ہو گا۔ یعنی ملک تو مل گیا۔ لیکن وہ علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کا پاکستان نہ بن سکا۔ خدا کے قانون مکافات کا مواخذہ ایسے موقع پر بڑا سخت ہو تا ہے۔

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

کراچی صدر اور حیدر آباد (قاسم آباد) سندھ میں

سلسلہ وار درس قرآن کریم کا اہتمام (بذریعہ ویڈیو کیسٹ) مندرجہ ذیل مقامات پر کیا گیا ہے۔

شہر و مقام		دن	وقت
کراچی صدر	فاروق ہوٹل ہال۔ زیب النساء سٹریٹ بالمقابل فٹ رائٹ شوز شاپ	جمعتہ المبارک	10 بجے صبح
حیدر آباد	12-B حیدر آباد ٹاؤن فیز 2 بالمقابل نسیم نگر قاسم آباد	جمعتہ المبارک بعد نماز عصر	

دعوت عام ہے تشریف لائیں

قرآنی لٹریچر۔ جملہ مطبوعات طلوع اسلام ٹرسٹ' مجلّہ طلوع اسلام کے تازہ شمارے درس کے دوران 35% رعایت کے ساتھ حاصل کئے جا سکتے ہیں۔

رابطہ : ایاز حسین انصاری نمائندہ بزم طلوع اسلام کراچی صدر' بزم طلوع اسلام قاسم آباد حیدر آباد (سندھ)
ٹیلی فون : کراچی 4571919 حیدر آباد 654906

ڈوبتے سورج کی صدا غور سے سن

عظمت ناز (بی۔ ایس سی' سال چہارم)

ٹک ٹک ٹک...... رات کے دو بج چکے تھے۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ آسمان پر کہیں کہیں تارے چمک رہے تھے۔ وہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی مطالعہ میں مصروف تھی کہ اچانک لائٹ بند ہو گئی۔ وہ اندھیرے میں دروازے کی سمت بڑھی اور باورچی خانے سے چراغ جلا کر دوبارہ اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ چراغ میز پر رکھ کر وہ دوبارہ اپنی نشست پر بیٹھ گئی۔ اس کی سوچیں مکمل طور پر اس کا گھیراؤ کر چکی تھیں اور وہ سوچوں اور یادوں کے سمندر میں کھو چکی تھی۔ وہ اپنے اردگرد سے بے خبر ایک نہایت پرسکون وادی میں گھوم رہی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے وطن کی سرزمین خوشحال ہو چکی ہے۔ اس کے ہم وطن ایک دوسرے سے پیار و محبت کے رشتے قائم کر رہے ہیں۔ ہر طرف محبت و الفت کے چراغ جل رہے ہیں' جس کی روشنی سے تمام دنیا مستفید ہو رہی ہے۔ امیر و غریب کا امتیاز ہٹ چکا ہے۔ اس کا پاک وطن ایک مکمل اسلامی فلاحی ریاست کی مثال بن چکا ہے۔ جہاں ہر شخص کو اپنے محسوسات بیان کرنے کا حق حاصل ہے۔ امرا کی بازیابی کے لیے غربا کی عزتوں کو پامال نہیں کیا جا رہا۔ ملک سے جہالت اور غربت کا خاتمہ ہو چکا ہے' کوئی شخص بھی نان شبینہ کی خاطر اپنی انا و عزت کو نیلام نہیں کر رہا۔ لوگ دھوکہ دہی اور قانون شکنی کے تصور سے ناواقف ہیں۔ علماء اور دانشور حضرات فتاویٰ فروشی اور الزام تراشی جیسے الفاظ سے ناواقف ہیں۔ ان کے قول و فعل میں اس قدر ہم آہنگی ہے کہ وہ پہلے کرتے اور بعد میں کہتے ہیں۔ وہ ایک دوسرے کی دل آزاری کو گناہ سمجھتے ہیں۔ ارباب اقتدار ملکی مفادات کو ذاتی مفادات پر ترجیح دے رہے ہیں۔ لوگ ضمیر فروشی سے باز آ گئے ہیں۔ ہر شخص راست بازی اور حق گوئی کا بہترین نمونہ نظر آتا ہے۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا ملک سیاسی' معاشرتی معاشی و مذہبی نظاموں میں مکمل طور پر ایک منظم اسلامی معاشرہ ہے۔ اس کی حسین آنکھیں دیوار پر بننے والے شعلے کے سائے پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ چشم تصور سے دیکھ رہی تھی کہ وطن عزیز میں توحید' عدل و انصاف اور مساوات کے عظیم اسلامی اصولوں کا مکمل نفاذ ہو چکا ہے۔ معاشرہ کا ہر فرد اپنی زندگی سے مطمئن نظر آتا ہے۔ اذان کی آواز پر کوئی مسلمان یہ نہیں سوچ رہا کہ وہ کس مسجد میں نماز ادا کرے بلکہ ہر فرد ایک اللہ' ایک رسول اور ایک قرآن کی پیروی میں سرگرداں ہیں۔ مسلم ممالک کے تمام مسلمان متحد ہو کر سارے عالم پر غلبہ حاصل کر چکے ہیں۔ اس کی سوچ کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا۔ اس نے دیکھا کہ اس کے وطن سے پھوٹنے والی امن و محبت کی یہ روشنی چاروں جانب بکھر گئی ہے۔ یہ روشنی جہاں پہنچتی ہے محبتوں کا پیغام سناتی جاتی ہے۔ یہ روشنی

کسی ایک فرد کے لیے نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لیے ہے۔ حتیٰ کہ عام انسان امن کی دنیا میں جا بسے ہیں۔ ایسی دنیا جو جنگ، قتل و غارت، بدامنی، جہالت، غربت اور فسادات سے پاک ہے۔ اس دنیا کا ہر انسان اپنے خالق کی حضوری میں سرگرداں ہے۔ اسے یہ دنیا اتنی پسند آئی کہ اس نے ہمیشہ کے لیے یہاں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے خیالات پرواز کی انتہائی بلندی پر تھے۔ اس کی آنکھیں دور جانے کس مقام پر لگی تھیں۔ وہ دور فضاؤں میں دیکھ رہی تھی، وہ اس دنیا میں کھو جانا چاہتی تھی۔ اچانک وہ اپنی نشست سے اٹھ کھڑی ہوئی اور سامنے کی دیوار کے پاس جا کر رک گئی۔ جس پر عالم اسلام کا نقشہ لگا تھا۔ اس پر چمکتا ہوا سبز رنگ اسے بہت پسند تھا۔ اس نے عرب کی مقدس زمین پر ہاتھ رکھا اور اسے بوسہ دیا۔ اب وہ ایک بار پھر کھو چکی تھی۔ اس کی آنکھیں سرزمین عرب کے افق سے طلوع ہونے والے آفتاب کو دیکھ رہی تھیں۔ جس کی روشنی دور دور تک پھیل چکی تھی۔ اس نے دیکھا کہ اس مقدس سرزمین سے فرزندان اسلام کفر کی زنجیروں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے توڑ دینے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کے گھوڑے جس زمین پر پاؤں رکھتے، وہ زمین انہیں سجدہ کرتی اور وہ اس زمین کے خالق کو سجدہ کرتے آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے۔ پھر اس کا ہاتھ فلسطین کی سرزمین پر پھر گیا۔ اس نے اپنے عظیم بہادر رہنماؤں کے بارے میں سوچا جنہوں نے اس خطہ زمین کو پر امن بنانے کے لیے لاکھوں قربانیاں پیش کی تھیں۔

پھر اچانک اسے ایسا لگا جیسے وہ کسی خواب سے بیدار ہو گئی ہو۔ اس کی آنکھ جو کھلی تو منظر ہی بدل چکا تھا۔ پیغمبران اسلام کی اس سرزمین فلسطین میں بے سکونی اور بدامنی کی آگ لگی تھی۔ ایسی ہی آگ اسے کشمیر، بوسنیا، اور عراق کو جلاتی ہوئی دکھائی دی۔ اس آگ نے اس کی پر امن دنیا کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ اسے ایسا لگا جیسے کسی نے اسے آسمان سے زمین پر دے مارا ہو۔ باہر بوندا باندی ایک بڑے طوفان کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ بادلوں کی دل دوز چیخوں نے اسے اس تلخ حقیقت کا احساس دلا دیا کہ وہ کس دنیا میں ہے۔ اب وہ اس دنیا میں واپس لوٹ چکی تھی جہاں ہر طرف جنگ، بدامنی اور ظلم و ناانصافی کا بازار گرم تھا۔ اسے اپنا آپ بوجھل محسوس ہونے لگا۔ وہ وہیں فرش پر بیٹھ گئی۔ اس کے ہاتھ خود بخود دعا کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس نے اپنے رب سے دنیا کے ہر انسان کے لیے بھلائی کی دعا مانگی۔ آنسو تیزی سے اس کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ اس کی سسکیاں تاریک ویران کمرے میں بڑی عجیب اداسی پھیلا رہی تھیں۔ اس کی غم زدہ آواز سے در و دیوار لرز اٹھے۔۔۔ اچانک ہوا کے تیز جھونکے سے کھڑکی کے پٹ زور سے کھل گئے۔ ایک عجیب بے ہنگم سا شور اسے سنائی دیا۔ اسے خبر ہی نہ ہوئی کہ کب رات بیت گئی۔ وہ دوڑ کر کھڑکی کے قریب پہنچی، سامنے ہی سڑک پر بہت سے لوگ ہاتھوں میں بینر اٹھائے کسی ظلم کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ وہ سب تیرہ معصوم لوگوں کے ظالمانہ قتل کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔ اپنے وطن کی اس حالت پر اس کے دل نے خوب ماتم کیا۔ جلوس آگے

بڑھ گیا مگر وہ وہیں کھڑی آسمان کو گھورتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب وحشت عود آئی۔ وہ زور سے چلائی ـــــ کوئی ہے ـــــ کوئی ہے جو اس کی بکھری ہوئی قوم کو سمیٹ سکے؟ کچھ دیر خاموش رہی۔ جواب ملا کیا کوئی نہیں؟ جو اس بھٹکے ہوئے قافلے کو اس کی منزل کا پتہ دے سکے۔ کیا اب کبھی کوئی راہبرو راہنما ادھر نہیں آئے گا؟ اس کے سب سوالوں کا جواب بھیانک خاموشی تھی۔ وہ وہیں ساکت کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئیں جیسے کسی کا انتظار کر رہی ہوں۔

وہ اس بدنصیب قوم کی بیٹی تھی جس نے خود روشنی کو چھوڑ کر اپنے لیے تاریکیوں کا انتخاب کیا تھا۔ اس کی قوم اپنا نصب العین چھوڑ کر گمراہی کا راستہ اپنا چکی تھی۔ وہ حساس دل لڑکی سوائے غم زدہ ہونے کے کچھ نہ کر سکتی تھی۔ وہ ہر وقت کسی بے چین روح کی طرح ادھر سے ادھر گھومتی جیسے کسی کی تلاش میں ہو' کبھی وہ گھنٹوں چھت پر کھڑی سورج کو تکتی اور کبھی چاندنی راتوں میں چاند کی روشنی میں بیٹھی اپنے محبوب راہنما کا انتظار کرتی۔ وہ تنہا تھی' کوئی نہ تھا جو اس کے دکھ بانٹتا' اس کی امید بندھاتا' اسے تسلی دیتا۔ وہ اکیلی روتی اور اکیلی ہنستی ـــــ پھر ایک دن اس نے ایک مضبوط فیصلہ کیا۔ وہ اپنی ساری ہمتیں اور حوصلے جمع کرتی دنیا کو نئی راہیں دکھانے کے لیے چل پڑی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ سچائی اور نیکی کی خاطر تمام باطل طاقتوں سے ٹکرا جائے گی۔

اس کا رخ اپنی قوم کے سوئے ہوئے اکابرین دین کی طرف تھا۔ اس نے پوچھا کہ کیوں تم اپنا فرض منصبی بھلا چکے ہو؟ تم سب کو اپنی کوتاہیوں کا حساب دینا ہوگا' جنہوں نے ذاتی مفادات کی خاطر پوری قوم کے مستقبل کو داؤ پر لگا دیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ ان سب کی زبانیں خاموش اور سر شرمندگی سے جھکے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں حرص و لالچ کی کڑیاں اور پاؤں میں مصلحتوں کی بیڑیاں تھیں۔ اسے قوم کے ان مذہبی راہنماؤں سے یہ توقع نہ تھی۔ جن کے دل پتھر کے ہوگئے تھے۔ جو اس کی التجاؤں اور سسکیوں سے بھی نہ پگھلے تھے۔ اس بے حسی نے اس کا دل توڑ دیا۔ وہ جانے کو واپس مڑی کہ ایک بھیانک آواز نے اس کے قدم روک دیے۔ اس نے اردگرد دیکھا کوئی نہ تھا۔ پر ایک آواز سنائی دی' کوئی ہنستے ہوئے کہہ رہا تھا کہ تمہاری سب کوششیں بیکار ہیں' تمہاری قوم اب کبھی منظم نہیں ہوسکتی۔ نہیں نہیں' وہ شدت جذبات سے چلا اٹھی۔ تم کون ہوتے ہو ایسا کہنے والے۔ ابھی میری امنگیں' میرے جذبے زندہ ہیں۔ میں ایک سادا قوم کی بیٹی ہوں جو وقتی طور پر غفلت کی نیند سوچکی ہے مگر ابھی اپنا مقصد نہیں بھولی۔ میں ضرور انہیں واپس پرانی راہوں کی طرف موڑنے میں کامیاب ہو جاؤں گی ـــــ

ایک قہقہہ اسے سنائی دیا۔ جواب ملا میں وقت ہوں اور تمہیں بتانے آیا ہوں کہ وہ زمانہ بیت چکا۔ جب تمہاری قوم کے علماء و اکابرین علم و حکمت کو قوم کی اصلاح اور ان کی سربلندی کے لیے استعمال کرتے تھے۔

اسی وقت یہ سب ایک بات ایک قرآن کی تعلیم دیتے اور اسی پر عمل کرتے تھے۔ ان کی طاقت کا راز آپس کی محبت اور اتفاق تھا۔ مگر رفتہ رفتہ اس اتفاق و اتحاد کی جگہ نفاق و تفرقہ نے لے لی۔ تفرقہ پرستی کی اس روایت نے تمہاری قوم کو کمزور اور کھوکھلا بنا دیا۔ دین کے ان ٹھیکیداروں نے تمہاری قوم کے بہادر افراد کے دلوں میں نفرت کے بیج بو دیئے۔ انہیں آپس میں لڑوایا' ان کے درمیان اختلافات بڑھتے چلے گئے۔ نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔ آج ہر گروہ کی مسجد' امام' طریقت الگ ہے۔ ان کی انفرادی و اجتماعی زندگی کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ کیا ایسے حالات میں تم ایک مستحکم معاشرہ کی تعمیر کے متعلق سوچ سکتی ہو؟ جب کہ تمہارے دینی راہنما اپنے فرائض کو فراموش کر چکے ہیں—— وہ زخم خوردہ تھی مگر پرامید تھی۔ سوچنے لگی کہ وہ وقت کے ساتھ لڑ سکتی ہے؟ اس نے با آواز بلند وقت کے سوال کا جواب دیا ہاں میں اب بھی ایسا سوچ سکتی ہوں۔ اس نے سوچا مجھے وقت سے بھی تو حساب لینا ہے۔ وہ چلائی مکار' فریبی دھوکے باز تونے کیوں میری قوم کے سربراہوں کو بے راہ روی کی روش پر چلنے کے لیے مجبور کیا۔ کیوں؟ بولو جواب دو' تم نے ایسا کیوں کیا؟

ہا ہا ہا—— وقت اس پر ہنسا—— میں نے—— دیوانی لڑکی تم اپنی قوم کی کوتاہیوں کا الزام مجھے دے رہی ہو۔ جب کہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ یہ سب تمہاری قوم کے اپنے بداعمال کا نتیجہ ہے۔ یاد کرو اپنا ماضی جب سلطنت عباسیہ کو ختم کرنے کے لیے باطل قوتیں اکٹھی ہو رہی تھیں۔ اس وقت تمہارے علماء دین اپنے ذاتی مفادات کو قوم کے مستقبل پر ترجیح دے رہے تھے۔ تب انہوں نے دشمنوں سے گٹھ جوڑ کر کے تمہارے درمیان تفرقہ' نفرت اور اختلافات کی دیواریں کھڑی کر دیں۔ اس وقت یہ سب ایک دوسرے کو ختم کرنے اور اقتدار کی ہوس میں اپنی عظیم روایات' تہذیب و تمدن کو غیروں کے ہاتھ بیچنے پر آمادہ تھے۔ تمہاری یہ حالت تھی کہ جب ایک اسلامی ملک پر دشمن ملک حملہ کرتا تو دوسرے اس کی مدد کی بجائے دشمن کا ساتھ دیتے۔ اگر تم تھوڑا سا غور کرو تو آج بھی سب کچھ ویسا ہی ہے۔ بس چہرے بدل گئے ہیں۔ اکابرین دین آج بھی اپنے مفادات کے لیے قوم کو مختلف گروہوں میں منقسم کر رہے ہیں۔ اپنی انہی بداعمالیوں کی وجہ سے تم دوسروں کے غلام بن کر رہ گئے ہو۔ وہ زور سے بولی نہیں ہم کسی کے غلام نہیں' ہم تو آزاد ہیں۔ آج کرہ ارض پر 72 سے زیادہ ممالک میں اسلامی حکومتیں قائم ہیں اور ایک کھرب سے زیادہ لوگ مسلمان ہیں۔ پھر ہم کیسے غلام ہوئے۔ نہیں ہم غلام نہیں ہیں۔ اس نے دلیل دی۔ وقت نے پھر کہا پگلی اپنے آپ کو دھوکا مت دو' تم جانتی ہو کہ امت مسلماء اپنے راہنما کی تعلیمات کو بھلا چکی ہے۔ تمہارا کوئی مرکز نہیں اس لیے تم بکھرے ہوئے ہو۔ کسی قوم کا اتحاد و یکجہتی اس کی اصل طاقت ہوتی ہے۔ مگر تم تو مختلف ٹکڑوں میں بکھرے ہوئے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تعداد میں زیادہ ہونے اور وسائل کی فراوانی کے باوجود تم دوسری قوموں سے بہت پیچھے ہو۔

تمہارا دعویٰ ہے کہ تمہارے پاس دنیا کا سب سے مستحکم معاشی نظام موجود ہے' جس کے تحت افراد معاشرہ

میں دولت اور وسائل کی تقسیم مساوی ہوتی ہے۔ مگر اس وقت پورے عالم اسلام میں کہیں بھی ایسا نظام معاش رائج نہیں جو سود سے پاک ہو۔ تو تمہارا اپنا ملک سودی نظام معاش کی وجہ سے بیرونی ممالک کا مقروض ہے۔ جس کی وجہ سے تم بزدل بن گئے ہو۔ تمہارے حکمرانوں کے سر بیرونی طاقتوں کے آگے جھکے ہوئے ہیں اور تمہارے ہاتھ غیروں کے سامنے بندھے ہوئے ہیں۔ تمہاری فکری اور عملی صلاحیتوں پر غیروں کا قبضہ ہے۔ وقت نے اپنے حق میں ایک اور دلیل دی۔ تمہارا یہ بھی دعویٰ ہے کہ تمہارے پاس عدل و انصاف' مساوات اور اسلامی جمہوریت پر مبنی ایسے اعلیٰ معاشرتی اصول ہیں جن کو اپنا کر کوئی بھی قوم پوری دنیا کی راہنمائی کر سکتی ہے۔ جب کہ اس کے برعکس تمہارے اپنے ملک کے لاکھوں افراد ہر روز ایک نئے ظلم کا شکار ہو رہے ہیں۔ کیونکہ تمہارے ہاں لاقانونیت' ظلم' جبر و ناانصافی کا غلبہ ہے۔ تمہارے پاس ـــــ چپ ہو جاؤ۔ میں کہتی ہوں چپ رہو۔ وہ اس طنز کو مزید برداشت نہ کر سکی۔ وہ ایک بار پھر سر جھکائے کھڑے علماء دین سے مخاطب ہوئی کہ خدارا ہوش میں آؤ۔ اپنی صفوں میں اتحاد پیدا کرو اور قوم کو اپنے اندر اتحاد و یقین کی قوت پیدا کرنے کی تلقین کرو۔ صرف یہی طاقت مسلم قوم کی ڈگمگاتی کشتی کو سہارا دے سکتی ہے۔ وہ انہیں محبت کا پیغام دیتی رہی۔ التجائیں کرتی رہی مگر ان پر ذرا برابر اثر نہ ہوا۔

وہ ان سے مایوس ہو کر تھکے تھکے قدموں سے واپس مڑی۔ وقت اب بھی اس پر ہنس رہا تھا کہ تم سوال کرتی ہو ان سے جن کی آج بھی وہی حالت ہے جو کل تھی۔ جو آج بھی ابوداؤد جیسے مکار اور شاطر لوگوں کی روایات کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ یہ نہ کبھی تمہارے ساتھ مخلص تھے نہ آئندہ ہوں گے۔ کیا تم جانتی ہو کہ ان کے سر کیوں جھکے ہوئے ہیں۔ اس لیے نہیں کہ تمہارے سوالوں کے جواب ان کے پاس نہیں۔ بلکہ یہ اس لیے خاموش ہیں کہ خود ان کی کوتاہیوں نے ایسے حالات پیدا کر دیے ہیں کہ اب کوئی سوچ ان کے مردہ دلوں کو زندہ نہیں کر سکتی۔ نہیں کر سکتی نہیں کر سکتی۔

اسے یہاں وحشت محسوس ہونے لگی' اس کا دم گھٹنے لگا۔ وہ یہاں سے بھاگنا چاہتی تھی مگر اس کے پاؤں حرکت نہ کر سکے۔ وقت کی مکروہ آواز اس کے حوصلوں کو شکست دینے پر تلی تھی۔ وہ یہاں سے مایوس ہو کر لوٹی تو سیدھی ارباب اختیار کے پاس پہنچی۔ یہاں اس کے دل پر کچھ اور زخم لگے۔ کیونکہ اس کے وطن کے حکمران ایک دوسرے کی طاقت کو ختم کرنے کے لیے آپس میں گتھم گتھا تھے۔ اپنے اقتدار کو زندہ رکھنے کے لیے وہ سب ملک و قوم کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ وہ اپنے اختیارات کو مضبوط بنانے کے لیے ایک دوسرے پر یوں حملے کر رہے تھے جیسے شکار کو پہلے حاصل کرنے کے لیے ایک بھیڑیا دوسرے بھیڑیے کو ختم کر دیتا ہے۔ یہ سب حالات اس کے لیے ناقابل برداشت تھے۔ اس کے اندر ان کو للکارنے کی طاقت ابھی باقی تھی۔ وہ زور سے بولی رک جاؤ اس سے پہلے کہ تم ایک دوسرے کو ختم کر ڈالو میرے صرف ایک سوال کا جواب دے دو۔ کسی نے

پوچھا کیسا سوال؟ وہ بولی کیا تم اقتدار کی ہوس میں اتنے آگے نکل آئے ہو کہ اپنے راہنما کی ہدایت کو بھی فراموش کر چکے ہو؟ کیا اللہ نے زمین پر حکمرانی اور اختیارات تمہیں اس لیے دیئے تھے کہ تم اس کی نعمتوں کے شکر کے بدلے میں ان کا مذاق اڑاتے پھرو؟ خدارا اپنے اندر فکر پیدا کرو۔ اپنے فرائض منصبی کو پہچانو اور خلق خدا کی بہتری کے لیے کام کرو—— وہ تھوڑی دیر اس کی بات سنتے رہے اور پھر جھگڑنے لگے۔ اس کی آواز اس بے ہنگم شور میں دب کر رہ گئی۔ وہ پھٹی پھٹی ویران آنکھوں سے یہ سب کچھ دیکھتی رہی۔ وقت کی آواز اس کا تعاقب کرتی یہاں بھی پہنچ گئی۔ وہ پھر اس سے مخاطب ہوا میں نے کہا تھا کہ تمہاری یہاں کوئی نہیں سنے گا۔ یہ سب تمہارے ماضی کے ان حکمرانوں کا دوسرا روپ ہیں جو کل تمہاری شکست و زوال کا باعث بنے تھے۔ ان نااہل حکمرانوں نے مسلمانوں کو عظیم سلطنتوں ہسپانیہ' خوارزم' سپین' اور غرناطہ کو خود اپنے ہاتھوں دشمنوں کے حوالے کیا تھا۔ بغداد کے خلفاء یہ بھول چکے تھے کہ وہ جن دشمنوں کے ساتھ مل کر غرناطہ اور خوارزم کے خلاف سازشوں میں مصروف ہیں۔ وہ کل کو خود انہیں بھی مٹا کر نیست و نابود کر سکتے ہیں اور ایسا ہی ہوا۔ جب مسلمانوں کی اندرونی کمزوریوں اور نااہل حکمرانوں کی وجہ سے ان کے بڑے بڑے علاقے دشمن کے قبضے میں چلے گئے تو بغداد کی سلامتی خطرے میں پڑ گئی جو مسلمانوں کا مرکز تھا۔ اس کے ختم ہوتے ہی مسلمانوں کا زوال شروع ہوا جو آج تک جاری ہے۔

اس بار وہ کچھ نہ بولی چپ چاپ سنتی رہی۔ جیسے تھک گئی ہو۔ اس کا دل اور روح زخمی تھے۔ دوڑتے دوڑتے اس کے پاؤں لہولہان ہو گئے تھے۔ اس کی آنکھیں پتھرا گئی تھیں۔ مگر اب بھی ایک امید اسے چلنے پر مجبور کر رہی تھی۔ اس کی امیدوں کا آخری سہارا اس کے ہم وطن مسلمان تھے۔ وہ اپنے وطن کے گلی کوچوں میں نکل کھڑی ہوئی۔ اسے یقین تھا اس کے ہم وطن ضرور اس کا ساتھ دیں گے۔ اس کی امنگیں پھر جاگ اٹھیں۔ اس نے سب سے پہلے ایک عدالت کے دروازے پر دستک دی مگر وہاں کا منظر دیکھ کر اس کی روح کانپ گئی۔ اس نے دیکھا وہاں ظالم کا پلڑا بھاری اور مظلوم کا پلڑا جھکا تھا۔ وہ یہاں سے بھاگی تو شہر کے بازاروں' گلیوں میں نکل گئی۔ وہاں ہر طرف چور بازاری' ملاوٹ' ذخیرہ اندوزی اور دھوکہ دہی کا بازار گرم تھا۔ ان حالات نے اس کے دکھوں میں اور اضافہ کیا۔ وہ یہاں سے بھاگی تو ایک مسجد میں پناہ لی۔ وہ یہ دیکھ کر تڑپ اٹھی کہ اللہ کے گھر تو خالی پڑے ہیں جب کہ عیاشی کے اڈوں پر لوگوں کے ہجوم کھڑے ہیں۔ وہ روتی ہوئی شہر کی ایک مجلس میں پہنچی جہاں لوگ ایک دوسرے کے خلاف سازشوں میں مصروف تھے۔ ہر طرف بے یقینی اور بدامنی کی فضا تھی۔ ہر چہرہ دوسرے سے خوفزدہ تھا۔ ہر ایک کی کوشش تھی کہ دوسرے کو پیچھے چھوڑ کر خود آگے نکل جائے—— وہ چلا اٹھی میرے عزیز ہم وطنو تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تمہارے درمیان یہ نفسا نفسی کیسی ہے۔ خدا کے لیے ہوش میں آؤ' تمہارا سب سے بڑا دشمن وقت تمہارا مذاق اڑا رہا ہے۔ آؤ میرے ساتھ مل

کر اس کے سوالوں کا منہ توڑ جواب دو۔ دیکھو تمہاری قوم کی ایک بیٹی سب سے مایوس ہو کر تمہارے پاس مدد کے لیے آئی ہے۔ اس کا ساتھ دو۔ تمہاری یہ بیٹی وقت کو قائل کرتے کرتے تھک گئی ہے۔ اگر تم نے بھی اس کا ساتھ نہ دیا تو وقت تمہیں مٹا دے گا۔ مٹا دے گا ـــــ اس کی آواز دم توڑتی چلی گئی ـــ لوگوں کے شور میں اس کی آواز دب گئی۔ اس کی آخری امید اس کے ہم وطنوں نے بھی اس سے منہ موڑ لیا تھا۔ اس کی حالت اس مسافر کی سی تھی جس کی کوئی منزل نہ ہو۔ وہ زخم خوردہ مسافر لڑکی ان جانے' ان دیکھے راستوں پر نکل گئی۔ اب وہ بے حس' خود غرض معاشرے سے بہت دور نکل آئی تھی۔ وہ شکستہ حال مسافر کی طرح اجاڑ ویرانوں میں سفر کر رہی تھی۔ وقت کی آواز اب بھی اس کے تعاقب میں تھی۔ وہ رکی اور وقت سے مخاطب ہوئی خدا کے لیے میرا پیچھا چھوڑ دو۔ تم جیت گئے' میں ہار گئی۔ میں یہاں سے دور جا رہی ہوں۔ تم میرا پیغام میری قوم تک ضرور پہنچانا کہ سورج ابھی ڈوبا نہیں ہے۔ اس کی روشنی ابھی زندہ ہے اور تمہیں خود کو پہچاننے کا موقع دے رہی ہے۔ ڈوبنے والا ہر سورج نئی صبح لے کر آتا ہے۔ ہر صبح تمہیں اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ آسمان پر ابھی روشنی باقی ہے۔ اے لوگو تم اندھیری راتوں سے مت ڈرو بلکہ اس روشنی کو بچاؤ اپنے لیے اپنی آئندہ نسلوں کے لیے۔ ایسا نہ ہو کہ یہ روشنی تم سے جدا ہو تو پھر لوٹ کر کبھی نہ آئے۔ ستاروں بھرا آسمان تو ہو مگر روشنی نظر نہ آئے۔ اس سے پہلے ہی تمہیں اپنے لیے نئے راستے تلاش کرنے ہیں۔ راستے جو بڑی منزلوں کا پتہ دیں ـــ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ولکم الویل مما تصفون القرآن

جو کچھ تم کہتے ہو' قابل صد افسوس اور موجب ہزار تباہی ہے

کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟

بشیر احمد عابد- کویت

موجودہ دور میں جب اسلام کے نفاذ کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو دانشوروں کی ایک کلاس اس کی سخت مخالفت کرتی ہے- ان حضرات کو اس حقیقت سے تو انکار نہیں کہ اسلام ایک زمانے میں زبردست قوت بن کر ابھرا اور جہاں جہاں تک پھیلا وہاں سے ظلم واستحصال کا خاتمہ کر کے نوع انسان کو امن و خوشحالی سے ہمکنار کیا- لیکن آج ایسا ممکن نہیں آج کے سیاسی و معاشی مسائل پہلے سے کہیں زیادہ پیچیدہ اور مشکل ہیں اور آج کی استحصالی قوتیں زیادہ زیرک اور قوی ہیں- ان سے نبرد آزما ہونے کے لیئے اسلام کے اصول و اقدار ناکافی ہیں- ان دانشوروں کے نزدیک اس کی واضح اور بین دلیل یہ ہے کہ فی الوقت کوئی اسلامی مملکت ایسی نہیں جو ان اصول و اقدار پر قائم ہو اور نہ ہی کسی اسلامی مملکت کیلیئے ممکن ہے کہ وہ ان اصول واقدار کو بطور سسٹم آف گورنمنٹ اختیار کر سکے- للذا' اس دور میں اسلام کی اہمیت بجز ایں نیست کہ یہ ایک چلا ہوا کارتوس ہے-! ہمارے نزدیک ان کا یہ مفروضہ سراسر غلط گہی پر مبنی ہے- اس حقیقت کا جائزہ' ہم چند سطور آگے چل کر لیں گے پہلے ایک نظر تاریخ عالم پر ڈالتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ انسان کا اس کائنات میں صحیح مقام کیا ہے؟ اس کے وجود کے اغراض ومقاصد کیا ہیں؟ اور اس کی موانعات و مشکلات کیا ہیں؟

انسان کو کرۂ ارض پر قدم رکھے ہوئے ایک عرصہ گذر چکا ہے- اس دوران اس نے بہت زیادہ ترقی کی ہے اور اپنے رہن سہن کو کافی محفوظ اور پرسکون بنا لیا ہے- یہ سب کچھ اس لئے ممکن ہوا کہ اس نے قوانین فطرت کا بغور مطالعہ کر کے اپنے آپ کو ان سے ہم آہنگ کر لیا ہے- شروع شروع میں قوانین فطرت کا علم نہ ہونے کی بنا پر اسے کافی مشکلات و مصائب کا سامنا رہا- آندھیاں' طوفان' زلزلے' اور وبائیں بستیوں کی بستیاں اجاڑ کر رکھ دیتیں' لیکن انسان ان کے سامنے بے بس تھا-

ہرے بھرے باغات' لہلاتے کھیت' پکی فصلیں سیلابوں کی نذر ہو جاتیں اور یہ کف افسوس ملنے کے سوا کچھ نہ کر سکتا۔ مال مویشی موذی امراض کا شکار ہو جاتے' آل اولاد آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر جان دے دیتی لیکن یہ ان کی کچھ مدد نہ کر سکتا تھا۔ مختصر یہ کہ جب تک انسان نے قوانین فطرت کا علم حاصل نہیں کیا تھا اور ان سے ہم آہنگی اختیار نہیں کر رکھی تھی اس کی زندگی کا ہر پہلو کرب و اذیت میں مبتلا تھا۔ لیکن جوں جوں تجربے اور مشاہدے کی بنا پر علم میں اضافہ ہوا' انسان کی گرفت کائناتی قوتوں پر مضبوط سے مضبوط تر ہوتی چلی گئی' اس نے اپنے آپ کو ان سے ہم آہنگ کر کے اپنے ماحول کو کافی موزوں و موافق بنا لیا۔ اب یہ ان موسموں میں فصلیں کاشت نہیں کرتا جو تباہیاں لاتے ہیں۔ ان جگہوں پر آبادیاں نہیں بساتا جہاں زلزلے اور طوفان آتے ہوں۔ اور ان تمام اسباب و علل سے دور رہتا ہے جو اس کے لیئے کسی بھی مصیبت کا باعث بن سکتے ہوں۔ انسان کو اس حقیقت کا بخوبی علم ہو گیا ہے کہ یہ کائنات نہ تو کسی کی منشاء کے مطابق چلتی ہے اور نہ رکتی ہے۔ اس کائنات کا ذرہ ذرہ اٹل اور محکم قوانین کے تابع روبہ عمل ہے۔ اور یہاں کی کوئی شے بھی ان قوانین سے روگردانی یا سرکشی اختیار نہیں کر سکتی۔

قرآن کریم میں ارشاد ہے :

> زمین پر چلنے والے ذی حیات ہیں یا فضائے آسانی میں اڑنے والے پرندے' طبعی تخلیق کے اعتبار سے'
> وہ بھی تمہاری ہی جیسی انواع ہیں۔
> ان کے لیئے ہم نے کتاب فطرت میں تمام قوانین مکمل طور پر دے رکھے ہیں۔
> وہ سب کے سب بلا چون و چراں اپنے رب کی طرف سے دی ہوئی رہنمائی کے گرد جمع رہتے ہیں اور
> ذرہ بھر ادھر ادھر نہیں ہٹتے (6:38)

قوانین فطرت سے اغماض برتنا' روگردانی کرنا' یا سرکشی اختیار کرنا کائنات کی کسی شے کے لیئے ممکن نہیں ہے۔ چونکہ انسان بھی اسی کائنات کا حصہ ہے لہٰذا اس سے وہ بھی مستثنیٰ نہیں۔ اس حقیقت کو نہایت بلیغ انداز میں یوں بیان کیا:

> حقیقت یہ ہے کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کوئی بھی ہے' طوہاً" و کرھاً" قانون خداوندی کے
> سامنے جھکا ہوا ہے جو کوئی روگردانی کا مرتکب ہوتا ہے' وہ بھی بالآخر اسی کی طرف لوٹ آتا ہے۔ (3:82)

انسان اور دیگر اشیائے کائنات میں فرق یہ ہے کہ اسے عقل و فراست عطا کی گئی ہے اور اپنے اعمال کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ یہ انسان کا بنیادی شرف و امتیاز ہے اور اسی کی بدولت اسے اختیار و ارادہ کی آزادی حاصل ہے۔ دیگر اشیائے کائنات قانون خداوندی کی اطاعت کرنے پر مجبور ہیں جبکہ انسان کو یہ اختیار حاصل ہے کہ چاہے تو اطاعت کرے اور چاہے تو انکار! عقل و فراست کا تقاضا ہے کہ انسان ہر کام سوچ سمجھ کر کرے حتیٰ کہ قانون خداوندی کی اطاعت بھی اندھا بن کر نہیں بلکہ علی وجہ البصیرت کرے۔ اس باب میں ارشاد خداوندی ہے:

> - اور یاد رکھو! جس بات کا تمہیں ذاتی طور پر علم نہ ہو۔ اس کے پیچھے مت لگو۔ اس ضمن میں تم پر بہت

بڑی ذمہ داری عاید ہوتی ہے۔ اس لئے کہ خدا نے تمہیں صاحب اختیار و ارادہ بنایا ہے' مجبور جانور نہیں بنایا۔ اس اختیار کے استعمال کے لیئے ذرائع علم و تحقیق (سماعت، بصر' فواد) عطا کر دیئے ہیں اور اگر تم نے ان سے کام نہ لیا تو اس کے ذمہ دار ٹھہرائے جاؤ گے۔ (17:36)

اس حکم خداوندی کے مطابق ہر انسان پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے اردگرد کے ماحول کا خوب مطالعہ کرے اور ہر شے کا علم حاصل کرے۔ لیکن انسانوں کی اکثریت اس ہدایت پر عمل نہیں کرتی۔ انسان کی فطرت میں کاہلی' جلد بازی' اور عزم کی کمی پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ جو کام بھی کیا جائے اس کا نتیجہ فوری طور پر سامنے آجانا چاہئے۔ ایسے کام جن کے نتائج نسبتاً" جلد برآمد ہوتے ہیں' انسان ان کی طرف راغب ہو جاتا ہے اور قوانین خداوندی کی حقانیت سے انکار کر دیتا ہے۔ یہی چیز انسان کی غلط نگہی کہلاتی ہے۔ قرآن کریم نے بھی اس کی تائید کی ہے۔

اصل یہ ہے کہ ان کی اکثریت حقائق کا پورا پورا علم حاصل نہیں کرتی اور یونہی جذبات میں بہہ کر یا اندھی تقلید کی بنا پر اعراض برتتے ہیں۔ (21:24)

دیگر اشیائے کائنات کو اس کی قدرت ہی نہیں حاصل ہوتی کہ وہ علم کی بنیاد پر اپنی راہیں خود منتخب کریں۔ ان کے مقاصد حیات اور طریقہ کار کا تعین خدا نے از خود کر دیا ہے' اور انکی مسئولیت بھی اتنی ہی ہے جتنی کہ ان کی استطاعت! گائے کا کام چرنا چگنا اور دودھ دینا ہے! دہی' پنیر' اور رس ملائیاں بنانا اس کی ذمہ داری نہیں۔ اولذکر فرائض سے وہ انکار نہیں کر سکتی اور ثانی الذکر کا اس سے تقاضا نہیں کیا جا سکتا' جیسا کہ شہد کی مکھی کے باب میں ارشاد ہے:۔

تمہارے رب نے شہد کی مکھی کو یہ حکم دیا کہ تم انسانوں کی صحت و شفا کے لیئے خالص شہد تیار کرو۔۔۔ (16:68)

شہد کی مکھی اس دن سے اس حکم پر نہایت صدق و خلوص کے ساتھ عمل پیرا ہے۔ یہ پہاڑوں' وادیوں' بیابانوں میں لمبی لمبی مسافتیں طے کر کے' درخت درخت' کلی کلی گھوم کر قطرہ قطرہ رس نچوڑتی ہے۔ اور پھر اس سے خالص شہد تیار کر کے چھتے میں سربمہر کر دیتی ہے۔

اس کام کی سرانجامدہی میں ذرہ بھر کوتاہی یا خیانت کی مرتکب نہیں ہوتی۔ اسے نہ تو اتنی عقل ہے اور نہ ہی مجال سرتابی! یہ قدرت صرف انسان کو حاصل ہے۔ یہی حکم اگر انسان کو دیا جاتا تو یہ اس کی مرضی پر منحصر ہوتا کہ وہ آپ کو خالص شہد کھلاتا ہے یا اس کے بدلے چینی کا شیرہ! انسان اگرچہ شہد کے ساتھ سب کچھ کر سکتا ہے مثلاً چینی ملا سکتا ہے' موم ملا سکتا ہے' اسے زیادہ مفید اور طاقتور بنا سکتا ہے اور بالکل ناکارہ بھی۔ لیکن یہ حقیقت اپنی جگہ اٹل ہے کہ یہ خالص شہد کے خواص نہیں بدل سکتا۔ کیونکہ یہ کلمات اللہ کے تابع ہیں۔

قانون فطرت سے روگردانی کر کے جو نتائج حاصل کیئے جاتے ہیں وہ صریحاً" دھوکہ ہوتا ہے۔ اور وہ بھی کسی اور کے

ساتھ نہیں بلکہ خود اپنے نفس کے ساتھ دھوکہ! اہل ایمان جو اس حقیقت کا شعور رکھتے ہیں کہ شہد وہی ہوتا ہے جو شہد کی مکھی وحی خداوندی کے مطابق تیار کرتی ہے' وہ کبھی بھی اس قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ قانون خداوندی کی خلاف ورزی کے عواقب بڑے سنگین ہوتے ہیں۔ اگر کسی کو اس زندگی میں ان کا سامنا کرنا نہ پڑے تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہمیشہ کیلئے چھوٹ گیا۔ زندگی موت سے ختم نہیں ہو جاتی بلکہ آگے چلتی ہے۔ مرنے کے بعد ان کا سامنا یقینی ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے :-

> اس وقت ایک نئے نظام عدل کی بساط بچھے گی۔ مجرم اور شریف انسان الگ الگ ہو جائیں گے۔
> جو ذرہ برابر بھی قانون خداوندی کا اتباع کریگا اس کی حسن عمل کا خوشگوار نتیجہ اس کے سامنے آجائیگا۔
> اور جو ذرہ برابر قانون کی خلاف ورزی کریگا اس کی سزا پائیگا۔ (96:6_8)

انسانی اعمال کو نتیجہ خیز بنانے میں قوانین فطرت نہایت سخت گیر واقع ہوئے ہیں۔ یہ کسی ایک عمل کو بھی بلا نتیجہ نہیں رہنے دیتے۔ حتیٰ کہ نگاہوں کی خیانت اور دلوں میں گذرنے والے خیالات تک کو بار آور کر دیتے ہیں۔ یہ تمام کارگہ کائنات اس لیئے سرگرم عمل ہے کہ انسان کا ہر عمل ٹھیک ٹھیک نتیجہ پیدا کرے اور کسی کے ساتھ کوئی ظلم و زیادتی نہ ہو۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر خدا چاہتا تو وہ ہمارے اعمال پر فوری گرفت بھی کر سکتا تھا' لیکن یہ تدریجی ارتقاء اور ربوبیت کے تقاضوں کے منافی ہوتا' اس لئے خدا کے قانون مکافات میں مہلت کی شق بھی رکھ دی گئی ہے۔ تاکہ جو لوگ اس دوران اپنی اصلاح کرنا چاہیں انہیں اس تباہی سے حفاظت کا سامان مل جائے۔ اور ان کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کا انتظام ہو جائے۔

ہم نے یہ بحث اس نقطہ سے شروع کی تھی کہ یہ کائنات اٹل اور محکم قوانین کے تابع روبہ عمل ہے اور یہ قوانین تمام اشیائے کائنات کو محیط ہیں۔ انسان بھی چونکہ اسی کائنات کا حصہ ہے' لہٰذا اس کی عافیت اسی میں ہے کہ وہ اپنے آپ کو ان قوانین سے ہم آہنگ کر لے۔ انسان کو اختیار وارادہ کی جو آزادی حاصل ہے' اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ان قوانین کی خلاف ورزی بھی کر سکتا ہے۔ اگر ایسا کریگا تو اس کی قرار واقعی سزا پائیگا۔ زندگی جوئے رواں کا نام ہے۔ یہاں نہ سہی ذرا آگے چل کر دھر لیا جائیگا۔ ان قوانین کے عواقب سے بچنے کی ایک ہی صورت ہے۔ اور وہ یہ کہ ان سے مکمل ہم آہنگی اختیار کر لی جائے۔ ان کی تائید و نصرت کسی کے ساتھ نہیں ہوتی بجز اس کے کہ جو ان سے ہم آہنگ ہو جائے۔ (21:28) اس کائنات کا یہ اصل الاصول ہے۔ کائنات کی ہر شے۔ علاوہ انسان' اس اصول پر قائم ہے اور اپنے مفوضہ فرائض انتہائی خوش اسلوبی سے سرانجام دے رہی ہے۔ انسان چونکہ صاحب عقل و بصیرت ہے لہٰذا اس کے فرائض زندگی دیگر اشیاء کائنات سے مختلف ہیں۔ اس پر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ مثلاً اس نے اپنی بھوک پیاس مٹانے کے ساتھ ساتھ دوسروں کی بھی فکر کرنی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس کے رہنمائی کے لیئے قواعد و ضوابط بھی الگ ہیں۔ اس کی طبعی ضروریات تو عام آئین فطرت کے تابع ہیں لیکن معاشرتی زندگی کیلئے الگ ضابطہ دیا گیا ہے۔ بہرحال انسان کے لئے ان دونوں کی اطاعت کرنا لازم ہے۔ ان سے

روگردانی اور سرکشی کا نتیجہ انتہائی دردناک عذاب کی شکل میں سامنے آتا ہے۔

اس وقت نوع انسان جس عذاب میں مبتلا ہے۔ وہ اپنے قوانین کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے۔ قانون یہ تھا کہ ہر انسان محنت کرے اور کوئی کسی کی محنت کا استحصال نہ کرے۔ ظالم اور سرکش انسانوں نے اس سے روگردانی کی۔ خود محنت سے اعراض برتا۔ دوسروں کی محنت کو لوٹنا شروع کر دیا۔ اور یوں انسانوں کی ایک اکثریت کو غربت اور افلاس کے جہنم میں دھکیل دیا۔ قانون یہ تھا کہ معاشرے میں سب سے مساوی سلوک کیا جائے' سب کو مساوی مواقع فراہم کیئے جائیں۔ کسی کو کسی پر فوقیت نہیں ہونی چاہئے بجز اس کے کہ وہ آئین فطرت کے مطابق ہو۔ لیکن اقتدار کے بھوکے اور مال و زر کے حریص انسانوں نے ان تمام اقدار کو پامال کیا' معاشرے کے تمام وسائل پر قبضہ کر کے بے بس و مجبور انسانوں کیلئے نشوونما کی تمام راہیں مسدود کر دیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ہر طرف جہالت کا ایک ٹھاٹھیں مارتا سمندر ہے اور لوگوں کی اکثریت اس کی تہہ میں غرق ہے۔

یہ قوانین فطرت کے معاشرتی ضوابط سے انکار کا نتیجہ ہے کہ آج باوجود مادی آسائشوں کے انسانی معاشرہ جہنم بنا ہوا ہے۔ جس کے شعلے سب کے دلوں کو لپیٹ میں لیئے ہوئے ہیں۔ ہر نفس خوف و حزن کا شکار ہے اور کوئی اپنے آپ کو محفوظ و مامون محسوس نہیں کرتا۔ جسے رزق کی فراوانی حاصل ہے وہ اولاد کی منفعت بخشیوں سے محروم ہے اور جنہیں اولاد کی کثرت حاصل ہے وہ دو وقت کی روٹی کو ترس رہے ہیں۔ اور چونکہ ہر فرد نے مادہ پرستی کو زندگی کا شعار بنا رکھا ہے۔ لہٰذا مادی اشیاء کی کمی و بیشی ان کے امن و خوشحالی کو بری طرح متاثر کرتی ہے۔ قرآن کریم کے الفاظ میں جسے سنیئے' یہی کہتا نظر آئے گا کہ:۔ میں تجھ سے زیادہ مالدار ہوں اور میرا جتھا بھی مضبوط ہے۔ (18:34) ہر فرد کو یہ فکر لاحق ہے کہ میں کسی سے کم نہ ہو جاؤں اور اس کے لیئے ہر کوئی پاگل ہوا جا رہا ہے۔ صبح سے لیکر شام تک اسی سوچ میں غرق رہتا ہے کہ کس طرح مال بنایا جائے۔ یعنی مال اور اولاد زندگی کی زینت نہیں بلکہ مقصود بالذات بن گئی ہیں۔ ہم کسی کے اعمال کو اسی معیار پر پرکھتے ہیں۔ اور جو لوگ ان پیمانوں پر صحیح اترتے ہیں وہ صاحب عزت و تکریم کہلاتے ہیں۔ دولت کو علم پر فوقیت حاصل ہے اور قوت کو قانون پر! اگر فراز صاحب' صاحب علم ہیں اور نشیب صاحب' صاحب ثروت تو ان دونوں میں سے قدر و منزلت نشیب صاحب کو حاصل ہو گی خواہ وہ کتنے ہی نشیب میں کیوں نہ ہوں؟ عزت و تکریم کے یہ پیمانے قانون فطرت کی صریح خلاف ورزی ہے اس کی پاداش میں پورا معاشرہ جہنم بن جاتا ہے۔ ایسے معاشرے میں انسانوں کی اکثریت بیزار اور بے حس ہو جاتی ہے' ان کی نشوونما رک جاتی ہے اور ان پر موت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔

مادہ پرست معاشرے میں لوگ جذباتی اور بے صبرے بن جاتے ہیں۔ قوانین فطرت پر عمل کیلئے جتنی محنت درکار اور جس صبر و استقامت کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ لوگوں میں مفقود ہو چکی ہوتی ہے۔ ان کے حوصلے پست اور قوت برداشت دم توڑ دیتی ہے۔ پھر بجائے اس کے کہ ایک مخلص اور محنت کش کاشت کار کی طرح کھیتی بوئی جائے' پانی دیا جائے' گوڈی کی جائے اور فصل کے پکنے کا انتظار کیا جائے' لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ کسی طور دوسروں کی پکی پکائی فصل کاٹ کر اپنا گھر بھر لیا

جائے غرضیکہ انسانون کی اکثریت وحشی جانور بن جاتی ہے۔ انہیں پیاس بجھانے سے غرض ہوتی ہے۔ جائز طور پر یا ناجائز! جانور کو تو اس کی عقل ہی نہیں ہوتی کہ جائز کیا ہے اور ناجائز کیا؟ اسے پیاس لگتی ہے تو چشمے کا رخ کرتا ہے۔ پانی مل گیا تو پی لیتا ہے ورنہ صبر کر لیتا ہے۔ اسے پانی حاصل کرنے اور پیاس بجھانے کی کوئی دوسری ترکیب آتی ہی ہیں۔ لیکن انسان صاحب عقل ہے۔ اسے جب پیاس ستاتی ہے تو اس کی کیفیت مختلف ہوتی ہے۔ اسے پیاس بجھانے کی ہزار ترکیبیں سوجھتی ہیں۔ حتیٰ کہ یہ دوسرے انسانوں کا خون پینے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ انسان کو ان خون آشامیوں سے روکنے کیلئے اعلیٰ اخلاقی اقدار کی ضرورت ہوتی ہے۔ خارجی کائنات میں یہ اپنے تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں گرتا پڑتا ٹھوکریں کھاتا کبھی نہ کبھی منزل مقصود پر پہنچ جاتا ہے۔

یہی طریق تمدنی زندگی میں بھی اختیار کیا جا سکتا ہے لیکن یہاں جب اس کا کوئی تجربہ ناکام ہوتا یا مشاہدہ کرنے میں غلط فہمی ہو جاتی ہے تو اس کی پاداش میں نہ صرف خود ڈوبتا ہے بلکہ اپنے ساتھ سینکڑوں انسانوں کو غرق کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے رحم فرمایا اور انسان کی مشکلیں آسان کر دیں۔ اسے یہ علم اور رہنمائی وحی کے ذریعے عطا کر دی۔ قرآن کریم میں اس کے متعلق فرمایا۔ خدا کو اس کا علم ہے کہ اگر انسان کو علی حالیہ چھوڑ دیا جائے تو یہ اپنے جذبات سے مغلوب ہو جاتا ہے جس کا نتیجہ تباہی و بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ خدا نے یہ قوانین و ضوابط اس لیئے عطا کر دیئے ہیں کہ وہ انسانوں کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ وہ ان کے جذبات کو نہ تو رہبانیت کے شکنجوں میں کسنا چاہتا ہے اور نہ ہی انہیں بے لگام چھوڑ کر' انسانوں کے لیئے سامان ہلاکت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ (4:28)

طبیعی قوانین کے نتائج ٹھوس اور محسوس شکل میں سامنے آجاتے ہیں اور انسان کو انہیں تسلیم کرنے میں زیادہ حیل و حجت نہیں کرنی پڑتی۔ اخلاقی اقدار کے نتائج غیر محسوس ہوتے ہیں اور ان کا اثر انسانی ذات پر پڑتا ہے۔ لہٰذا انہیں تسلیم کرنا قدرے دشوار اور وقت طلب ہوتا ہے۔ مثلاً معاشرے میں بے یارو مددگار کا ساتھ نہ دینا اور مسکین کی روٹی چھین لینا' قانون خداوندی کی بین خلاف ورزی ہے۔ اس سے انسانی ذات کی نشوونما رک جاتی اور معاشرے کی بنیادیں کھوکھلی ہوجاتی ہیں۔ لیکن اس کے واضح آثار کب نمودار ہوتے ہیں؟ انہیں بصیرت کی آنکھ سے دیکھنے کیلئے علم اور محسوس طور پر دیکھنے کیلئے وقت چاہیئے۔ انسان کی عمر محدود ہے۔ جب تک وہ ان اقدار کو سمجھ پاتا ہے' اس کی عمر بیت جاتی ہے۔ اس علم و تحقیق کا فائدہ نئی نسل کو ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے عبرت حاصل کرے۔ لیکن وہ پہلی نسل سے بھی کہیں زیادہ گئی گذری ہوتی ہے۔ وہ آثار قدیمہ سے عبرت حاصل کرنے کی بجائے ٹکٹ لگا کر مال بنانا شروع کر دیتی ہے۔ علاوہ ازیں' اخلاقی اقدار کے نتائج کو مصدقہ بنانے کیلئے ایک نظام تشکیل دینا پڑتا ہے۔ اور اس کے لیئے ایک زبردست قوت نافذہ درکار ہوتی ہے۔ اس کے بغیر ان اقدار کی نتیجہ خیزی بری طرح متاثر ہوتی ہے۔ اور لوگوں کی اکثریت ان کی عملی افادیت سے منکر ہو جاتی ہے۔

انسانی کمزوریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے وحی کا سلسلہ شروع کیا۔ وحی کی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ حق بات کو فوراً اور واضح طور پر بیان کر دیتی ہے۔ سورۃ طٰہٰ میں ارشاد ہے۔ اے رسولؐ: یہ قرآن تجھ پر اس لیئے نازل کیا گیا ہے تا

کہ تو مشقتوں سے بچ جائے۔ یمن و سعادت کی راہیں تلاش کرنے میں جو دشواریاں اور مصیبتیں جھیلنی پڑتی ہیں تو ان سے اس قرآن پر عمل کرنے سے بچ جائیگا۔ (20:1)_ وحی کی دوسری خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ یہ اقدار کے ساتھ ایک نظام دیتی ہے جسے ہر رسول قائم کرتا ہے۔ اس نظام میں ہر انسان کی عزت نفس محفوظ ہوتی ہے اور ہر طرف سلامتی اور خوشحالی کا دور دورہ ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی نگاہ میں ایسا معاشرہ جنت بداماں ہوتا ہے۔ اس کے متعلق فرمایا:۔

> اس معاشرہ میں کوئی ناشائستہ بات۔ کسی قسم کا بے مقصد شور و شغف یا بے نتیجہ ہنگامہ آرائی نہیں ہو گی۔ اس میں ہر بات انسانی ذات کی تکمیل کا ذریعہ اور انسانیت کے لیئے موجب امن و سلامتی ہو گی۔ اور ہر ایک کو سامان نشوونما متواتر و مسلسل ملتا رہیگا۔ (19:62)

وحی کی رہنمائی سے مستفید ہونے کے لیئے ضروری ہے کہ اس کے پیش کردہ حقائق پر خوب سوچ و بچار کیا جائے۔ اس کی تعلیمات کا تعلق براہ راست انسانی ذات کی نشوونما سے ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد ہے:

> تمہارے رب کی طرف سے بصیرت افروز حقائق آگئے۔ جو ان کی طرف سے آنکھیں بند کرے گا اس کی غلط روش کا تباہ کن نتیجہ اسی کو بھگتنا پڑیگا۔ (6:10)

اس سے واضح ہے کہ جب تک وحی کی تعلیمات پر سوچ سمجھ کر عمل نہیں کیا جائیگا۔ اس سے مفید مطلب نتائج برآمد نہیں ہونگے۔ لوگوں کی آنکھ سے خیانت' دل سے منافقت' بغض و عناد اور کمینگی دور کرنے کے لئے ضروری ہے وہ اس پر برضا ورغبت عمل کریں۔ اگر اس ضمن میں شائبہ بھر بھی جبر و اکراہ سے کام لیا گیا تو وہ قانون خداوندی کی خلاف ورزی ہو گی۔ یہ جو لوگوں کی اکثریت وحی کی رہنمائی سے محروم رہتی ہے تو اس کی بنیادی وجہ یہی ہے۔ لوگوں کی اکثریت سوچ و فکر کرنے کی عادی نہیں ہوتی۔ مولویوں' سرمایہ داروں' جاگیرداروں اور حکمرانوں نے ان کی سماعت و بصارت کو ناکارہ کر دیا ہوتا ہے۔ لہٰذا' جب کبھی بھی کوئی نئی چیز سامنے آتی ہے اسے ہنسی مذاق میں اڑا دیتے ہیں۔ اور یہ آج کی بات نہیں بلکہ شروع سے ہوتا چلا آرہا ہے۔ ارشاد ہے۔

> ان کی طرف جب بھی کوئی توانین و ضوابط پہلی بار آئے' انہوں نے ان پر کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا۔ انہیں محض تفریحا" سنتے رہے۔ (21:2)

ایک طرف لوگوں کی یہ کیفیت کہ ان کی اکثریت یا تو اسلاف کی فرسودہ راہوں پر ریوڑ کی طرح بے حس چل رہی ہوتی ہے یا خود اپنے ہی جذبات کے طوفان میں منزل سے کوسوں دور گرداب میں پھنسی کشتی کی طرح ہچکولے کھا رہی ہوتی ہے۔ اور دوسری طرف خدا کا یہ قانون مشیت کہ کوئی شخص ایمان نہیں لا سکتا جب تک عقل و فکر سے کام لیکر صحیح نتیجہ پر نہ پہنچے۔ اس لیئے کہ جو لوگ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے ان پر بات واضح نہیں ہو سکتی۔

(10:100)

ایسی صورت احوال ایک داعی حق کے لئے انتہائی مشکلات کا باعث ہوتی ہے۔ اسے نہایت استقلال اور استقامت سے کام لینا

ہوتا ہے۔ پہلے پہل اس کی دعوت پر صرف وہی لوگ ایمان لاتے ہیں جن میں سماعت کی کچھ تھوڑی بہت رمق باقی ہوتی ہے۔ اسی لئے کہا:

> جو شخص تیری بات کو دل کے کانوں سے سنے گا وہ اس پر لبیک کہے گا۔ باقی رہے بے حس تو جب تک ان کی سماعت کی راہ میں حائل رکاوٹیں دور نہیں ہونگی وہ اس طرف رجوع نہیں کریں گے۔ (6:36)

انسان کی سماعت کی راہ میں حائل کئی طرح کی رکاوٹیں ہوتی ہیں۔ سب سے سنگین رکاوٹ اسلاف کا مسلک ہوتا ہے۔ لوگ اس کی اندھی تقلید کرنے کے عادی بن چکے ہوتے ہیں۔ اس کا نشہ ہیروئن کے نشے سے بھی زیادہ طاقتور ہوتا ہے۔ مولوی حضرات اس کو اسقدر مقدس اور مزین کر کے پیش کرتے ہیں کہ ایک عام انسان کیا اچھے اچھے ڈاکٹر' پروفیسر اور دانش ور اس مسلک کے علی الرغم سوچنے کی ہمت نہیں کر پاتے۔ علاوہ ازیں' دوسری بڑی رکاوٹ مفاد عاجلہ کی کشش ہوتی ہے۔ انسانی فکر نے جتنے معاشرتی نظام تخلیق کئے ہیں ان میں مفاد عاجلہ کے حصول کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ جب اعلیٰ اقدار اور مفاد عاجلہ کے مابین تصادم پیدا ہوتا ہے ۔ اکثر انسان اعلیٰ اقدار کی پاسداری نہیں کر پاتے۔ اور ان پر کوئی کان نہیں دھرتا۔ جیسا کہ ارشاد ہے:-

> جب ان کے سامنے قرآنی احکام و قوانین پیش کئے جاتے ہیں تو یہ جماعت مومنین سے کہتے ہیں کہ تم یہ بتاؤ کہ ہم دونوں پارٹیوں میں سے کونسی ایسی ہے جس کی پوزیشن اعلیٰ اور جس کی محفلیں زیادہ آراستہ و پیراستہ ہوتی ہیں۔ بس اسی سے سمجھ لو کہ کون صحیح راستے پر ہے۔ اور کون غلط راہ پر۔ (19:73)

ایسی سنگین رکاوٹوں اور موانعات کی موجودگی میں وحی کے پیغام پر کون توجہ دے سکتا ہے۔ قانون فطرت کے اس حصے کی کون اطاعت کر سکتا ہے۔ خود طلوع اسلام والے جن کا دعویٰ ہے کہ وہ وحی کے پیغام پر علی وجہ البصیرت عمل پیرا ہیں۔ ان میں سے کئی ایک ابھی تک۔ **خیر مقام** اور **احسن ہذیا** کی طلسماتی دنیا میں بس رہے ہیں۔ اور اس انتظار میں ہیں کہ کہیں کسی جگہ یہ نظام قائم ہو تو وہ قدم رنجہ فرمائیں۔

ہم نے مندرجہ بالا سطور میں دیکھا کہ انسان کی اس کائنات میں کیا پوزیشن ہے؟ اس کی نشوونما کے تقاضے کیا ہیں؟ یہ کن قوتوں کا مالک ہے اور اس کی کمزوریاں اور خامیاں کیا ہیں؟ دوسری طرف قوانین فطرت کی محکمیت اور ہمہ گیری پر بھی ایک نگاہ ڈالی۔ ہم نے دیکھا کہ انسان اور قوانین فطرت کے مابین کیا رشتہ ہے؟ کہاں ہم آہنگی پائی جاتی ہے؟ اور کہاں تضاد؟ ہم نے انسانی موانعات اور مشکلات کا جائزہ بھی لیا۔ اور معلوم کیا کہ قوانین فطرت کا وہ حصہ جن کا تعلق انسان کی تمدنی و معاشرتی زندگی سے ہے اور جو انسانی علم سے ماوراء ذریعہ علم وحی کی وساطت عطا کیئے جاتے ہیں۔ انسان اور ان کے مابین رشتہ استوار کرنے کیلئے ایک سنٹرل اتھارٹی کی ضرورت ہوتی ہے۔ وحی کی زبان میں اسے فریضہ رسالت کہا جاتا ہے۔ جو خود رسول جب تک زندہ ہوتا ہے سرانجام دیتا ہے۔ اور ان کے بعد ان کے جانشین! یہ سعادت مند ہستیاں بھی خود رسول ہی کی طرح خالص وحی خداوندی کی روشنی میں سفر کرتی ہیں۔ (حسبنا کتاب اللہ)۔

اگر کسی حادثاتی وجوہ کی بنا پر یہ جماعت ختم ہو جاتی ہے تو پھر اس کی جگہ ایک ایسا زبردست خلا پیدا ہوتا جسے پر کرنے کے لیے صدیاں درکار ہوتی ہیں۔ اس دوران ایک دوسرا گروہ اُمڈ آتا ہے جسے عرف عام میں مذہبی پیشوا یا مولوی صاحبان کہا جاتا ہے۔ ان حضرات میں بوجوہ صلاحیت نہیں ہوتی کہ وحی کی تعلیمات کو خالص شکل میں پیش کر سکیں۔ ان کی اکثریت کو وحی کی بلند اقدار کا فہم و ادراک حاصل نہیں ہوتا۔ جن کو کچھ شد بد ہوتی ہے وہ طعن و ملامت کے خوف سے اسے بیان نہیں کر پاتے۔ اس طرح عامتہ الناس وحی کے نام پر ملاؤں کی افترا پردازیوں کا شکار ہو کر دین و دنیا دونوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ مولوی حضرات عوام کے ایک طبقے کو تو اس حد تک خوفزدہ کر دیتا ہے کہ وہ تمام زندگی لوٹا مصلی اٹھائے قریہ قریہ رضائے الٰہی کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے۔ اس کے برعکس ایک دوسرے طبقے کو اس قدر بے باک اور نڈر کہ وہ ایک سو ایک مسکینوں کا خون چوس کر بھی اپنے آپ کو حق کی راہ پر سمجھتا ہے۔

مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری لازم ملزوم ہوتے ہیں۔ جس معاشرے میں مولوی ہو گا وہاں سرمایہ دار بھی ہو گا۔ جس طرح دور کہیں فضا میں دھواں دیکھ کر اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے نیچے آگ ہو گی بعینہٖ اسی طرح معاشرے میں مولوی کو دیکھ کر آپ بالیقین کہہ سکتے ہیں کہ یہاں ضرور سرمایہ دار بھی ہونگے خواہ وہ معاشرہ آپ کے لیئے کتنا ہی نامانوس کیوں نہ ہو! انسان جب وحی کی روشنی سے محروم ہو جاتا ہے تو پھر یا تو وہ مولوی بن جاتا ہے یا سرمایہ دار! مولوی اور سرمایہ دار' دونوں کفر کی کوکھ سے جنم لیتے ہیں۔ اسلام میں ان کی قطعاً" کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسلام ایک نظام مملکت ہے' جسے عوام کے منتخب نمائندے وحی خداوندی کی روشنی میں باہمی مشاورت سے چلاتے ہیں۔ ان کا مطلوب و مقصود رضائے الٰہی ہوتا ہے اور یہ چیز وہ احکام خداوندی پر عمل کر کے حاصل کرتے ہیں۔ انہیں یقین کامل ہوتا ہے کہ عاقبت اسی کی سنورے گی جو قانون خداوندی سے مکمل طور پر ہم آہنگ ہو جائیگا۔ (رضی اللہ عنھم ورضوعنہ)۔ وہ احکام خداوندی کی مکمل اطاعت کرتے ہیں اور اپنے آپ کو ان کی خلاف ورزی کے عواقب سے محفوظ رکھتے ہیں۔ اسی میں ان کی ذات کی تکمیل ہے۔ اور اسی سے معاشرتی امن و سلامتی۔ ایسے صالح نظام میں مولوی اور سرمایہ دار کا کیا کام؟ یہ تو قومی زندگی کی دیمک ہیں جو انسانی صلاحیتوں کو چاٹ چاٹ کر کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ مولوی توہم پرستیوں اور فریب نفس میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ اور انسان کبھی کوئی کام اطمینان قلب سے سرانجام نہیں دے سکتا۔ سرمایہ دار حرص و آز کے جہنم بھڑکاتا ہے۔ یہ دولت کے بل بوتے معاشرتی نظام پر چھا جاتے ہیں اور ایسے ایسے قوانین وضع کرتے ہیں جو ان کے لیئے تو مزید راحت و سکون کا سبب بنتے ہیں لیکن ایک عام انسان بنیادی ضروریات زندگی بھی پورا نہیں کر سکتا۔ مولوی اور سرمایہ کی موجودگی میں اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں۔ اصل تعجب تو اس بات کا ہے کہ اسلام میں مولوی اور سرمایہ دار کہاں سے آگیا؟ جس معاشرے میں انسانوں کی اکثریت بھوک و افلاس' ننگ' جہالت اور بیماریوں کے بوجھ تلے دبی کراہ رہی ہو۔ بیواؤں' یتیموں' محتاجوں اور ناداروں کا کوئی پرسان حال نہ ہو۔ ظالم' جابر اور مستبد دندناتے پھر رہے ہوں اور ان کے آگے روک بن کر کھڑا ہونے والا کوئی نہ ہو۔ ایسے معاشرے میں عالیشان مساجد تعمیر کر کے امامت کے فرائض سرانجام دینا اور بنکوں میں لاکھوں کروڑوں جمع کر کے

اپنے آپ کو مسلمان سمجھنا کم از کم اسلام کی تعلیمات نہیں ہیں جو پندرہ سو سال پہلے حجاز کی مقدس سرزمین پر حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے کھجور کی چٹائی پر بیٹھ کر قائم کیا اور جن کے نزدیک سرمایہ کی یہ اہمیت تھی کہیں سے تین دینار گھر میں جمع ہو گئے اور آپ پر نزع کی کیفیت طاری تھی۔ جیسے ہی ہوش میں آئے' کہا انہیں فوری طور پر غربا میں تقسیم کر دیا جائے۔ آپؐ کے بعد آپؐ کے جانشینوں نے بھی اسی روش کو اختیار کیا۔ پوری تاریخ انسانیت میں ان کی مثال نہیں ملتی۔ باوجود بے پناہ خوشحالی اور فارغ البالی کے نہ تو محلات تعمیر کئے نہ محافظ و دربان رکھے' نہ یادگاریں قائم کیں اور نہ عوامی فلاح و بہبود کے نام پر کوئی ذاتی منفعت! جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ چالیس سال کی مختصر مدت میں اسلامی نظام کو وہ عروج حاصل ہوا جو آج تک کسی نظام کو حاصل نہیں ہو سکا۔

اس دور کے مسلمانوں اور آج کے مسلمانوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ وہ خالص قرآن کی تعلیمات پر عمل کیا کرتے تھے۔ جبکہ آج اس کے برعکس ہے۔ اس دور میں ہر وہ کام جو انسان کی منفعت کیلئے کیا جاتا تھا۔ اسے فی سبیل اللہ سمجھا جاتا تھا۔ آج ہر وہ کام جو انسانوں کی منفعت کے لیئے نہیں کیا جاتا اسے فی سبیل اللہ سمجھا جاتا ہے۔ اس دور میں مسلمان معاوضے کی پرواہ کئے بغیر ایک دوسرے کی مدد کیا کرتے تھے' آج بلا معاوضہ ایک قدم تک کوئی نہیں اٹھاتا۔ اس دور میں کسی کی ترقی کی راہ میں حائل کوئی رکاوٹ ہوتی تو اسے دور کر کے لوگ خوشی محسوس کرتے تھے۔ آج جب تک کسی کی راہ میں دس رکاوٹیں کھڑی نہ کر دی جائیں کلیجے کو ٹھنڈک نہیں پہنچتی۔ اس دور میں مسلمان آپس میں بڑے ہی نرم دل اور شیر و شکر ہوتے تھے لیکن دشمن کے خلاف سیسہ پلائی دیوائر بن جاتے۔ آج اس کے الٹ ہوتا ہے۔ امریکہ سے دوستی کر کے ہمیں بڑی خوشی حاصل ہوتی ہے۔ اس دور کا مسلمان سود سے نفرت کرتا تھا۔ آج شیر مادر کی طرح حلال و طیب سمجھتا ہے۔ آج کے مسلمان کو دیکھ کر اگر کوئی دانش ور اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ اسلام عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا تو وہ بالکل حق بجانب ہے۔ البتہ یہ اس کی غلط نگی ہے کہ جسے وہ اسلام سمجھتا ہے۔ وہ حقیقت میں اسلام نہیں ہے۔ اصل اسلام قرآن ہے۔ قرآن کی کیفیت یہ ہے کہ باوجود کثرت قرات کے مسلمانوں کی اکثریت اس سے نابلد ہے۔ مولوی حضرات کو لیجئے! ان کی حالت یہ ہے کہ ان کی اکثریت کو اتنا قرآن بھی نہیں آتا جو وہ ہر روز پانچ وقت کی نماز میں دہراتے ہیں۔ مفسروں اور مفکروں کی اکثریت سلف صالحین کے پنجہ استبداد میں جکڑی ہوئی ہے۔ ان کی مثال "زمین جنبد نہ جنبد گل محمد" جیسی ہے۔ وہ اپنی کسی بھی بات کے لئے اپنے طور پر دلیل دینے کے قابل نہیں۔ ہمیشہ سلف صالحین کا سہارا لیں گے! نتیجہ مسلمانوں کی اجتماعی فکر۔ کم از کم قرآن کریم کی حد تک جمود کا شکار ہے۔ یہی حال مسلمان حکمرانوں کا ہے۔ ان میں سب کے سب الا ماشاء اللہ قرآنی تعلیمات سے علی وجہ البصیرت بے بہرہ ہیں۔ لہذا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ یہ قرآن کو سمجھیں اور عمل کریں۔

قرآن کریم میں جو اصول و اقدار دی گئی ہیں وہ ابدی ہیں۔ ان کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ان کی افادیت ختم ہو گئی ہے۔ جس دور میں یہ نازل ہوئیں وہ انسانی تاریخ کا سیاہ ترین دور تھا۔ روئے زمین پر کہیں کوئی اقدار کی کرن دکھائی نہیں دیتی تھی۔ چاروں طرف جہالت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ قرآن کریم سے پہلے جو اقدار وحی تھیں وہ مکمل طور پر ضائع ہو چکی

تھیں۔ نوع انسان ہر کہیں مولویوں کی افترا پردازیوں اور حکمرانوں کی فساد انگیزیوں کا شکار تھی۔ قرآن کریم جس خطہ ارضی میں نازل ہوا اس کی حالت دیگر دنیا سے کہیں زیادہ ابتر تھی۔ معمولی معمولی تنازعات پر خون خرابہ شروع ہو جاتا جو سالہا سال جاری رہتا۔ فحاشی کی یہ انتہا کہ لوگ ماؤں اور بہنوں کے ساتھ شادیاں رچاتے۔ اور جہالت اس قدر کہ اپنی معصوم اولاد کو زندہ درگور کر دیتے۔ کوئی قانون نہ تھا کوئی اخلاقی قدر نہ تھی۔ کوئی حکومت نہ تھی۔ جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ جو جس کو دبوچ لیتا اسے اپنا غلام بنا لیتا تھا۔ قرآن نازل ہوا تو قواعد وضوابط ملے! راہ نما ملا اور رہ نمائی ملی! اس پر عمل پیرا ہو کر تمام معاشرتی ناہمواریوں کو دور کیا' ظلم و استحصال سے نجات حاصل کی اور بہت ہی کم مدت میں امن و سلامتی اور خوشحالی کا سنہری خواب حقیقت بن گیا! آج نوع انسان پھر ویسے ہی حالات سے دوچار ہے۔ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جو فساد اور خون ریزی کا شکار نہ ہو۔ فحاشی' جہالت' بربریت اور استحصال پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک شکل اختیار کر گیا ہے۔ مادی وسائل بہتر ہو جانے سے ظالموں اور مجرموں کی گرفت اور زیادہ مضبوط ہو گئی ہے اور ہر خطے' ہر نسل' اور ہر نوع کا انسان کرب و اذیت میں مبتلا ہے۔ آج قرآنی تعلیمات کی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔ اسلام چلا ہوا کارتوس نہیں بلکہ اسے چلانے کے لیئے ولولہ انگیز قیادت کی ضرورت ہے۔ ایک ایسی جماعت کی ضرورت جو صرف وعظ و تلقین پر ہی اکتفا نہ کرے بلکہ قرآنی اقدار پر مبنی نظام تشکیل دے اور ان کی افادیت کو عملی طور پر ثابت کرے۔ اس باب میں ارشاد ہے :۔ اے رسول! اس ضابطہ حیات کو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے' تمام انسانوں تک یکساں طور پر پہنچاتے رہو۔ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ کہو اسے کر کے بھی دکھاؤ۔ اس کے لیئے تمہیں ایک نظام تشکیل دینا پڑیگا۔ اور اگر تم نے ایسا کر کے نہیں دکھایا تو پھر سمجھ لو کہ تم نے فریضہ رسالت صحیح طور پر ادا نہیں کیا۔ اس راہ میں تمہیں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑیگا۔ لوگ تمہاری سخت مخالفت کریں گے۔ مولوی کفر کے فتوے لگائیں گے۔ اور سرمایہ دار استہزاء کریں گے۔ لیکن تم اس کی پرواہ نہ کرنا۔ یقیناً اللہ تمہیں ان کی مخاصمت سے محفوظ رکھے گا۔ خدا کے قوانین سے کفر برتنے والوں کے سامنے صحیح راہ کبھی نہیں آتی۔ (5:67) آج یہی فریضہ ہم سب پر عائد ہوتا ہے۔ **واللہ المستعان**

حکم عدولی توہین آقاء ہے

حسین امیر فرہاد

سندھ میں ایک ہندو رہتا تھا۔ جس کے دو بیٹے تھے۔ چھوٹا مدن جس کی سجاول میں دکان تھی۔ بڑا موہن جس کی بدین میں دکان تھی۔ ایک دن دونوں بیٹوں کو باپ کی طرف سے ایک ہی مضون کا خط ملا۔ باپ نے دونوں کو ہدایت کی تھی کہ گڑ ذخیرہ کر لو۔ مہنگا ہونے والا ہے۔ دو ماہ بعد باپ بیٹوں کی خبر لینے جایا کرتا تھا۔ جب چھوٹے بیٹے مدن کے پاس باپ پہنچا تو اس نے اچھی طرح استقبال کیا۔ باپ نے پوچھا میرا مکتوب تمہیں ملا؟ بیٹے نے کہا آپ کا مکتوب ملا تھا میں نے آپ کی ہدایت پر عمل کیا نتیجہ یہ نکلا کہ مجھے دو ہزار روپیہ کا اضافی منافع ہوا۔

دوسرے دن باپ بڑے بیٹے کے پاس گیا۔ وہ باپ کی بڑی عزت کرتا تھا۔ باپ کے چرن چھوئے قدموں کی مٹی ماتھے پر لگائی۔ کہا پدھاریئے پتا جی۔ باپ جب آرام سے بیٹھا تو پوچھا کہ میرا مکتوب تمہیں ملا؟ موہن نے کہا بے شک آپ کا مکتوب ملا تھا۔ میں نے اسے چوما اور یہ دیکھئے بھگوان کے چرنوں میں رکھ دیا۔ روز لوبان اور اگر بتی کی دھونی دیتا ہوں۔ باپ نے دیکھا کہ مکتوب ویسے کا ویسا بند پڑا ہے۔ باپ نے جوتی اتاری اور بیٹے کو مارنا شروع کر دیا۔ بیٹے نے کہا پتا جی میرا دوش تو بتا دیں۔ میں نے تو آپ کے مکتوب کو بڑی عزت دی ہے۔ باپ نے کہا اپرادھی۔ میرے مکتوب کی عزت تو یہ تھی کہ اسے کھول کر پڑھ لیتے، پھر میری بات پر عمل کرتے۔

قارئین کرام بعینہ کیا یہی حال ہمارا نہیں۔ جو موہن کا تھا۔ کیا ہم موہن کے بھائی بند نہیں؟ بیشک ہمارے نام مسلمانوں جیسے ہیں۔ مگر موہن میں اور ہم میں کوئی خاص فرق نہیں۔ اس نے تو اپنے پتا کے مکتوب کے ساتھ یہ عمل کیا۔ ہم پروردگار عالم کے مکتوب کے ساتھ یہی کچھ کر رہے ہیں۔ نہ سمجھنے کیلئے پڑھتے ہیں، نہ ہی عمل کرتے ہیں۔ البتہ مخمل میں لپیٹ کر لوبان اور اگر بتی کی دھونی دے رہے ہیں۔

ہمارا انجام کیا ہو گا یہ پتہ چلانا کوئی مشکل نہیں۔ گذری قوموں کی داستانیں قرآن مجید میں موجود ہیں۔ جن پر قرآن کریم نازل ہوا تھا۔ اور انہوں نے قرآن کریم کو پڑھنے تک محدود نہ رکھا تھا؟ یہ وہ لوگ تھے جو بقول علامہ اقبالؒ:

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر   اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

یہ ایک شاعر کے تخیل کی اڑان نہیں۔ ارشاد ربانی ہے۔ یوم الحساب پروردگار اپنے رسول صلعم کے زبان سے کہلوائیں گے۔

اور پیغمبر کہیں گے کہ اے رب! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا- کچھ لوگ کہہ سکتے ہیں کہ قرآن کو کہاں ترک کیا- ہر گھر میں ایک سے زیادہ قرآن کریم موجود ہوتے ہیں- صبح و شام ہر گھر سے قرآن پڑھنے کی آواز آتی ہے مسجد جاؤ تو وہاں بھی کثیر تعداد میں لوگ سر جھکائے قرآن مجید پڑھنے میں مشغول نظر آتے ہیں- ہر بچہ پیدا ہوتا ہے تو اذان کے ساتھ- دم نکلتا ہے یٰسین کے ساتھ- مگر حقیقت یہ ہے کہ اگر قرآن میں دیئے گئے احکامات و ہدایات پر عمل نہ کیا جائے تو یہ نہ صرف چھوڑنا ہوا- بلکہ اس کا مذاق اڑانے کے مرادف ہوا-

اللہ تبارک و تعالیٰ سے ہمار اتعلق عبد و مولا کا ہے یعنی آقا اور غلام کا- یہاں دنیا میں بھی جب کوئی آقا- مالک حکم دیتا ہے اپنے عبد فرما بردار خادم کو تو وہ حکم کی تعمیل کرتا ہے- اگر مالک کہے جاؤ گندم بوؤ- غلام کو جانا پڑتا ہے- مالک کہے یہ پھل مت کھاؤ- غلام کو ہاتھ کھینچنا پڑتا ہے- مالک کہے- چھڑکاؤ کرو- چارپائی بچھاؤ- مہمانوں کیلئے چلم لاؤ- چائے لاؤ- تو غلام کو یہ سب کچھ کرنا پڑا ہے- جو غلام احکامات کی بجا آوری نہ کرے- اس کی خیر نہیں ہوتی- اور پھر ایسا غلام جسے مالک کہے اخبار لے آ- وہ بھی کہے اخبار لے آ- مالک کہے پانی پلا وہ بھی کہے پانی پلا- مالک کہے کھانا لے آ- وہ بھی کہے کھانا لے آ- یعنی ایسا لگتا ہے وہ مالک کو وہی احکامات دے رہا ہے- جو مالک نے اسے دیئے تھے- اگر ایسا نہیں تو کم از کم وہ احکامات REPEAT یعنی دھرانے کی گستاخی تو کر رہا ہے- ایسے خادم کا تو مار مار کر حلیہ بگاڑ کر رکھ دینا چاہئے------ لعنت بھیجئے ایسے نامعقول خادم پر آیئے اپنا معائنہ کریں- کہیں ہم اس لعنتی خادم کی طرح تو نہیں؟

افسوس صد افسوس ہم بالکل اسی خادم کی طرح ہیں بلکہ اس سے بھی بدتر- ہمارے مالک نے ہم سے کہا سب کچھ اپنے لئے سمیٹ کر مت بیٹھ جانا- تمہارے مال میں ضرور تمندوں اور محروموں کا حق ہے (51-19) ہم نے اس کے برعکس کیا- حق داروں کا حق چھین کر انہیں محروم بنایا- مالک نے کہا آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ (2-188) ہم نے اپنی پہچان بنائی حرام خوری کی- کہا اپنی کمائی کو اللہ کے بتائے ہوئے نظام کی خاطر کھلا رکھو (2-195) ہم نے اللہ کے نظام کو پس پشت ڈال دیا- اپنا نظام بنا لیا- کہا شراب اور بلا پسینہ بہائے کمائی سے دور رہو (5-90) ہمارے امراء اتنی شراب پیتے ہیں کہ ہر وقت مخمور رہتے ہیں- اور آسانی سے دوت کمانے کو فن سمجھتے ہیں- کہا ہمیشہ واضح حکم اور سیدھی بات کرو (3-70) ہماری ہر بات ٹیڑھی ہوتی ہے- کہا خوبصورت انداز سے اعتدال کو قائم رکھتے ہوئے اچھی اچھی باتیں کرو- (17-53) ہماری محافل سے لیکر اسمبلیوں تک میں گالی گلوچ کا رواج ہے- کہا سچ کو جھوٹ کا لبادہ مت اوڑھاؤ- نہ ہی حق بات کو چھپاؤ- (2-42) ہمارے گھروں سے لیکر عدالتوں تک اس کے برعکس ہو رہا ہے- کہا بے حیائی کی باتوں کے قریب تک نہ جاؤ خواہ بے حیائی کھلے بندوں ہو یا چھپی ہوئی (6-152) بے حیائی تو ٹی وی کی شکل میں ہمارے گھروں کے اندر گھس آئی ہے- اشتہارت میں عورتیں جو جو حرکتیں کرتی ہیں- اگر وہ شارع عام پر ہوں- تو دست اندازی پولیس کا معاملہ بن جائے- ہمارے مالک نے تاکیدی طور پر کئی بار کہا- کہ فرقہ بندی سے دور رہو- فرقہ بندی شرک سے بڑا گناہ ہے (20-94) کہا اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو- آپس میں تفرقہ مت ڈالو (3-103) اور یہ کہ اللہ ایک ہے- ایک سے زیادہ نہیں- ہمیں دیکھئے- کہ ہم کتنے فرقوں میں

بٹے ہوئے ہیں۔ ہمارے مالک نے کہا۔ اس کتاب کو ضابطہ حیات بنا لو اسے آئین تسلیم کر لو۔ اپنی زندگی اس کے مطابق گزارو۔ اپنے تمام فیصلے اس کے مطابق کرو۔ جو ہم نے نازل کیا ہے۔ جو ایسا نہیں کریگا۔ وہ کافر ہے۔ خواہ وہ زبان سے اس قانون پر ایمان رکھنے کا مدعی کیوں نہ ہو (5-44) ہم نے دیگر کتب کو سینے سے لگا لیا۔ اس کتاب کو صرف پڑھنے تک محدود رکھا۔ حالانکہ ہمارے رب کا فرمان ہے۔ تم جس ہدایت کی آرزو رکھتے ہو وہ ہمارے اس ضابطہ قوانین کے اندر موجود ہے جس میں کوئی الجھن کوئی شک یا بے یقینی نہیں۔ یہ ضابطہ قوانین سفر زندگی میں ان لوگوں کو انسانیت کی منزل مقصود کی طرف لے جانے والی راہ بتاتا ہے۔ جو غلط راستوں کے خطرات سے بچنا چاہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو ہدایت کیا ہے۔ بلا شبہ انسانیت صدیوں سے بھٹک رہی تھی چاروں طرف اندھیرا تھا۔ وحی خداوندی اپنی اصلی شکل میں کہیں بھی موجود نہ تھی۔

اللہ کا تصور ہی مفقود تھا۔ جہالت کی ہنگامہ خیزیاں عروج پر تھیں۔ ایسے میں شاخ ابراہیمی سے گل سربلند حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے۔ بھٹکی ہوئی انسانیت کو سیدھی راہ پر لگانے کیلئے انہیں ہدایت (کتاب) دی۔ انہیں یہ نہیں کہا۔ کہ کسی غار میں بیٹھ کر اس کتاب کو پڑھا کرو۔ بلکہ یہ کہا۔ **یایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک** (5-67)

اے رسول اس ضابطہ حیات کو جو تیرے رب کی طرف سے تجھ پر نازل کیا گیا ہے (تمام انسانوں تک پہنچا دے) انہوں نے اور ان کے رفقاء نے اس فریضہ کو انجام دیا۔ دین ہم تک پہنچا دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد قرآن کے پیغام کو سمجھنا سمجھانا اور اس کے عطا کردہ نظام کو عملاً نافذ کرنے کی ذمہ داری امت مسلمہ کی ہے۔ (3-62-19-6) ہماری نجات موہن بننے میں نہیں۔ جس نے مکتوب پر عمل نہ کر کے جوتیاں کھائیں۔ ہمیں اس کتاب پر عمل کر کے اپنی زندگیوں کو صحابہ کرامؓ کے سانچوں میں ڈھالنا ہو گا۔

PAMPHLETS پمفلٹس

آرٹ پیپر کور (ART PAPER COVER) سے مزین کتابی سائز میں' درج ذیل پمفلٹس' بحساب 3 روپے فی پمفلٹ (علاوہ ڈاک خرچ) ادارہ ہذا اور بزمہائے طلوع اسلام کے دفاتر سے دستیاب ہیں۔

قارئین نوٹ فرمالیں۔

ENGLISH

1. Genesis and Ideology of Pakistan.
2. Economics in the Social Structure of Islam.
3. Is Islam a Failure?
4. Islamic Ideology.

اردو

1- اسلامی قوانین کے راستے میں کون حائل ہے۔
2- اسلامک آئیڈیالوجی۔
3- کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟
4- رحمتہ للعالمینؐ
5- دنیا نظام محمدیؐ کے لئے بیتاب ہے۔
6- کیا ہم آزاد ہیں۔

ادارہ کا مقصد و مسلک (تازہ ایڈیشن) خریداران کو مفت فراہم کیا جائیگا۔

چیئرمین ادارہ

قرآنی حقائق کو سمجھنے کے لیے

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

خود پڑھیئے،

دوسروں کو پڑھنے کے لیے پیش کیجئے

یہ

ایک ماہنامہ ہی نہیں بلکہ ایک زندہ اور زندگی بخش تحریک ہے، جس کا مقصد قرآنی فِکر کو اس طرح عام کرنا ہے کہ وہ نوجوانوں کے دِل کی گہرائیوں میں اُتر جائے اور وہاں سے صحیح آسمانی اِنقلاب بن کر اُبھرے!

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا

"اور پھر زمین اپنے ربّ کے نُور سے جگمگا اُٹھے"

بیادِ ثریّا عندلیبؒ

اِک عندلیب، فکرِ پرویں کی بخاری
مفہوم کی وہ حافظ، قرآن کی وہ قاری
گلشن کو اُس نے سینچا، خونِ جگر سے اپنے
پھولوں کی نغمہ خواں تھی، کلیوں کی غمگساری
راہِ عمل نے اُس کو جب بھی کبھی پکارا
تحریر واز تکلّم، کی حق کی پاسداری
کشتی تھی زندگی کی اُس کی تو بس شکستہ
ساحل کو رُخ نہ موڑا، منجدھار سے گزاری
گویا وہ ایک شمعِ گلستانِ فکرِ قرآں
جلتی تھی خود تو لیکن روشن کُنِ دیاری
اِک کشمکش ہمیشہ موت وحیات میں ہے
جیتی ہے موت اِس میں، ہردم حیات ہاری
ہے کون سا نفس جو اِس سے بچ سکا ہو
ہے آیۂ جلیلہ ”اَلْموْت“ حکمِ باری
جب آگیا فرشتہ لے کر پیامِ اجل کا
چھوڑ اِس جہاں کو وہ بھی سُوئے عدم سدھاری
صبر و رضا ہو حاصل تم کو اے سوگواراں!
مدفن ہو اُس کا باغ جنّت کی اِک کیاری
ہو عِلّیّین مسکن تیرا سعید رُوحے!
اے عندلیب آخر ثریّا مقام داری

(محمد سعید احمد قطبی)

11. **Consultation (Shoora)**. The Rasool (P) was enjoined to consult in day to day matters and in affairs of moment, ``Consult them in affairs. Then when you have taken a decision put thy trust in Allah" (3:158)

12. **Aesthetics**. Unlike the animals man is endowed with an aesthetic sense, a liking and taste for the apprciation of beauty. The Quran respects this trait in man and considers it a necessary element in the growth and development of his personality. ``say: who hath forbidden the adornment of Allah, which He hath brought forth for His servants and the good things of His providing?" (7:32)

13. **Forces of Nature**. ``And He has made subservient to you whatsoever is in the heavens and whatsoever is in the earth all from Himself (45:13).

Islam demands from us to subdue forces of Nature for the Purpose of utilising them in consonance with the permanent Values for the benefit of mankind (not for destrucive purposes).' says the Quran:

``Only that survives in the earth which is beneficial for all mankind" (13:17) which is in sharp contrast to Darvin's `survival of the fittest.' Darwin's adage is a clear indication, of Nature's cruelest principle `Might is right,' The Quranic view , on the other hand, stands for `Right is Might.'

14. **Knowledge and Education**.You cannot conquer the forces of Nature without the acquisition of adequate knowledge which in turn is possible only through a well established, elaborate and all-embracing system of education. The Quran is replete with injunctions to the believers to pursue knowledge. It eulogises those who do it and condemns those who do not. Allah has Himself exhorted the Apostle to pray ``O my Lord! advance me in knowledge" (Al-Quran 20:114). It is inconcievable to imagine an Islamic society that does not concern itself whole-heartedly and earnestly in the pursuit of knowledge and acquisition of education. Says Quran ``and none will grasps the message except men of understanding (3:7) And if you cannot grasp the message how can you establish a society in accordance with its contents".

believers." (64:2) The believers form one universal ummah which is not to be divided on any account.

4. **Human Personality Implies Responsibility**. Every human being will be held responsible for his own actions, rewards as well as punishment (retribution) which none else will share, ``whoever commits a crime commits it against his own self" (4:111) and none other will be held responsible for it, ``NO bearer of a burden bears another's burden." (53:38) This is the Law of Requital (قانون مکافات عمل) and is at the root of belief in the judgment Day and is therefore a Permanent Value according to the Quran.

5. **Freedom.** Paradoxically speaking freedom in Islam springs from a type of slavery which is complete subservience to the will of God. In the words of Allama Iqbal:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

Subservience is to God only. It means that none, not even the weakest is required to bow down before anyone but God. And none, not even the strongest is permitted to force anyone by any means whatsoever to bow down before him instead of God.

6. Justice. Justice is one of the fundamental Permanent Values ------- a corner-stone of the Deen and no distinction is made in this respect between friend and foe:- And let not hatred of a people incite you to act, unjustly, Be just, that is nearer to observance of duty (6:8). In this respect Qurans guidance is very clear and specific:-

1. Confound not truth with falsehood. Nor knowingly conceal the truth (2:42)
2. Hide not testimony (2:283)
3. Evidence must be given truthfully (4:135)
4. Be not an advocate for the fraudulent (4:105)
5. Never be a suspporter of the guilty. (28:17)
6. Be ye staunch in justice, witnesses for Allah, even if it be against yourselves or parents or kindred, a rich man or a poor man. (4:135)

But justice which means giving everyone his due is not considered enough in the Islamic society. Adl has to be supplemented with Ihsan which

means making good the deficiency of those who, in spite of best offorts, do not earn enough for the nourishment and fullest development of their physical bodies and selves (personalities)

7. **Subsistence**. According to the Quran, it is incumbent upon the Islamic society to provide for the basic necessities of each and all members comprising it, and make adequate provisions for the development of their human personalities. A society that fails to establish this order of Rabubiyyah and make it universal, does not deserve to be called Islamic. Having been established in the name of God, the Islamic society is bound to proclaim:

``We will provide for you and your childern" (6:152) Until the Islamic State is fully establised and has marshalled all its resources, this responsibiliy devolves upon the affluent.

``And they ask thee as to what they should give (for the benefit of others) say: whatever is surplus to your own requirements" (2:21() and in this their attitude should be such as to declare, ``We desire from you neither reward nor thanks" (76:9). (It would be pertinent here to state that while the development of our physical body depends on what we take the development of our self or personality depends on what we give (for the benefit of others)- ``In the stablity of their own personality (2:265)

8. **Freedom of will** -- no compulsion. ``There is no compulsion in Deen" (2:256)

Islam does not advocate forced acceptance of the Deen. The Message has to be fully absorbed and understood and subjected to the full light of Reason and Intellect, keeping the mnd fully open, and accepted only after full conviction. Acceptance without full conviction cannot truly be called Iman.(ایمان).

``And say: the truth is from your Rabb, so let him who pleases believe, and let him who pleases reject." (18:29)

9. **Tolerance**. When Islam does not believe in forced acceptance of the Deen, it follows that those who choose to remain outside the fold would not be treated unkindly as long as they remain peaceful and friendly (60:8). In fact they are to be treated kindly and justly and allowed to enjoy all the basic human rights.

10. **Enforcement of Law.** ``Allah loveth not lawlessness" (2:205) It is the duty of the Quranic Social order to ``enjoin what is right and forbid what is wrong." (3:109)

SALIENT FEATURES OF ISLAMIC SOCIETY

By : Rafeeq Ahmad

A truly Islamic Society cannot be established except in an independent Islamic state whose first and foremost requirement is the recognition of the absolute sovereignty of Allah and Allah alone. ``The command is for none but Allah" (12:40) ``Nor does He share His command with anyone whatsoever. (18:26) and ``In the subservience of the Sustainer, let nobody admit anyone as partner" (18:110)

But Allah the Transcendental Reality does not deal directly with human affairs. He exercises His command by means of revelation through His Messengers, ``Say! shall I seek for judge other than Allah, when He it is Who has sent unto you the detailed Book." (6:114)

Thus the sovereignty of Allah means the sovereignty of the Book The Holy Quran. This in turn is exercised through an organization. The central command of the organisation of Believers is the instrument to enforce the Divine law based on the permanent values and injunctions contained in the Book, so the salient features of the Islamic Society are in fact these permanent values and injunctions, which are:

1. **Respect for humanity**. The fact that every child at his birth is endowed with a self or personality, entitles every individual to equal esteem and respect, without any consideration whatsoever to the incidence of birth, family, tribe, race, community, nationality, colour, creed or Sex, for says the Quran:

``Verily we have honoured all children of Adam (equally) (17:70)

2. **Criterion of position in society.** Equality of esteem at birth does not, however, mean that all of them continue to have the same rank and status for ever. Says the Quran, ``And for all there are ranks according to what they do". (46:19) And the underlying principle for these ranks is, ``The noblest of you in the sight of Allah is the best in conduct" (49:13)

3. **Unity in Humanity**. All human beings according to the Quran are members of one universal brotherhood. ``Mankind is but one community" (2:213). There is only one criterion for division and that is ideology. ``It is He who has created all of you, some of you are non belivers and some of you are